اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اگست ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 August 2019

خدمتِ قرآن میں ڈاکٹر محمد امین کا ایک اور منفرد کام

”قرآنی الفاظ کے ترجمے کی بجائے قرآن کی عربی عبارت کے مفہوم کی اردو میں منتقلی“
اسلاف اور جمہور مفسرین کی مطابقت کے ساتھ

رواں، سلیس اور شستہ اسلوب
صرف اردو ترجمہ پڑھیں تو بھی لطف آئے اور بات پوری طرح سمجھ میں آئے
اور تفسیر و حواشی سے بڑی حد تک بے نیاز کرے

پنج سورہ

الفاتحہ، یٰسٓ، الرحمن، الواقعہ، الملک و پارہ عمّ

سفید کاغذ اور مضبوط گتے کی جلد، صفحات ٧٦
ہماری لاگت مع ڈاک خرچ ١٦٠ روپے

ہدیہ: خدمت قرآن میں آپ کو شریک کرنے کے لیے صرف ١٠٠ روپے
بذریعہ: وی پی، منی آرڈر، موبی کیش (اکاؤنٹ نمبر 0306-4640366)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰ صفحات
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
❁ تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
❁ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰
❁ تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات	۷۲
❁ پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۷۶
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۴۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

مکتبہ البرھان، 97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
0309-4607124

بلا معاوضہ

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

- صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
- پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
- جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں اور رٹے سے دور
- اساتذہ اور طلبہ (و طالبات) کے لیے الگ کتابیں
- اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون: 0333-4287640،0300-4354673

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۳، شمارہ ۸، اگست ۲۰۱۹ء/ ذی القعدہ ۱۴۴۰ھ

مشمولات

○فکر و نظر

کب اُٹھو گے؟ | مدیر | ۴

○تعلیم و تربیت

- علوم اسلامیہ میں تحقیق کی ابتر صورتِ حال | سید خالد جامعی | ۵
- تعلیم کی نظریاتی جہت اور اس کے تقاضے | پروفیسر ملک محمد حسین | ۱۰
- پاکستان میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی بربادی | ڈاکٹر پرویز ہود بھائی | ۱۵
- حفظ قرآن کو بدعت کہنا گمراہ کن ہے | ڈاکٹر محمد امین | ۱۸

○فہم دین

- قرآن حکیم کی بعض اہم اصطلاحات | مدیر | ۳۰
  نفس، قلب، روح، عقل (اور دماغ) میں فرق
- جدید دینی تحریکوں کی حکمت عملی | ۳۵
- تجدد کا پائے چوبیں | پروفیسر زاہد صدیق مغل | ۳۷
- پاکستان میں تجدد کی پھیلتی ہوئی تحریک | ڈاکٹر محمد امین | ۳۹

○اسلام اور پاکستان

- جاوید غامدی مولانا اصلاحی کے شاگرد نہیں ہیں | ڈاکٹر انوار احمد بگوی | ۴۱
- تاریخ کو مسخ کرنے کا حربہ | محمد عاصم حفیظ | ۴۵
- پاکستان میں اسلام | پروفیسر ملک محمد حسین | ۴۸
  بے شمار مثبت پہلو لیکن نتیجہ صفر

○تفہیم مغرب

- امریکی میڈیا کی حقیقت | ڈاکٹر مجاہد کامران | ۵۱
- مغربی تہذیب کا ناسور | مولانا عبید اللہ خالد | ۵۵

○متفرق

میں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ | ابوعمیر | ۵۶

فکر و نظر

کب اُٹھو گے؟

تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟
تم غالب تھے، مغلوب ہو گئے
تم حاکم تھے، محکوم ہو گئے
کیوں؟

تم ذلت کے جس گڑھے میں گرے ہو اس سے باہر کیوں نہیں آ پاتے ؟
آنکھیں کھولو! وہ آنکھیں جو مغرب کی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہیں
دماغ کے دریچے کھولو! وہ دریچے جو غلبۂ مغرب کے ردّ عمل کا شکار ہو چکے ہیں
سوچو! تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟

سوچو!
اٹھو!
تم اٹھتے کیوں نہیں ہو؟

کب اٹھو گے؟
جب پانی سر سے گزر جائے گا!

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی[۱]

علوم اسلامیہ میں تحقیق کی ابتر صورتِ حال

علماء کرام، علوم اسلامیہ کے پروفیسرز اور پی ایچ ڈی کے طلبہ توجہ فرمائیں

ہمارے ایک محترم دوست جو عالمِ دین بھی ہیں، ایک کانفرنس میں مقالہ پڑھنے سعودی عرب جا رہے تھے۔ مقالہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر تھا۔ انہوں نے ای میل سے اس کا مسودہ ہمیں بھیجا اور درخواست کی کہ اس میں پندرہ بیس حوالوں کا اضافہ کر دیجیے اور مقالے کی نوک پلک سنوار دیجیے۔

آج کل عالمی کانفرنسوں میں شرکت کا شوق بعض علماء کو مضمون نگار بننے پر اکسا رہا ہے۔ ویسے بھی جب سے علماء نے سیکولر مخلوط تعلیمی اداروں سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنا شروع کی ہے، سیکولر اداروں میں ملازمت کے مواقع انہیں ملے ہیں اور اب ۲۵ ہزار روپے پی ایچ ڈی الاؤنس بھی ملنے لگا ہے، جو کسی مدرسے کے شیخ الحدیث کی تنخواہ کے برابر ہے، تو ان میں محقق اور مقالہ نگار بننے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ گو پی ایچ ڈی کرنے والے ان فضلاء کا مطالعہ بہت محدود ہے۔

نظریہ ارتقاء پر حضرت والا کا مقالہ پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ مضمون نگار کی اکثر معلومات کا سرچشمہ الندوہ کی فائل، شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، مولانا مودودی کی تحریروں اور مولانا آزاد کی تفسیر و مضامین کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ عربی جرائد کے مضامین اور کچھ اُردو انگریزی اسلامی جرائد کے مقالات سے استفادہ کیا گیا تھا لیکن اصل مآخذ سے رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔ راقم نے مضمون ملنے پر حضرت والا سے عرض کیا: ڈارون نے اپنی ایک Note Book میں Tree of life کا ذکر کیا ہے۔ وہ درخت کیا ہے؟ اس کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں؟ جواب ملا: جی نہیں، کبھی سنا نہیں۔

ہم نے پوچھا: ڈارون پر 'روایت' کے مکتب فکر کی تنقید کیا آپ نے پڑھی ہے اور حسین نصر کی کتاب *Traditional Islam in the Modren World* میں جو تنقید ہے کیا

---

[۱] سابق ناظم شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

وہ آپ کی نظر سے گزری ہے؟ جواب ملا: جی نہیں۔ ہم نے پوچھا: انسائیکلو پیڈیا فرانسے جلد پنجم میں Living organism کے مدیر اور فرانسیسی ماہر ارضیات پال لیموان نے مختلف شرکاء کی تحریروں پر جو نوٹ لکھا ہے کیا وہ آپ نے دیکھا ہے؟ جواب ملا: اس کتاب کا نام بھی نہیں سنا۔ ہم نے کہا: کیا آپ نے ڈارون کی Note Books دیکھی ہیں؟ جواب ملا: نہیں۔

پھر ہم نے پوچھا: کیا آپ نے فرانسیسی ماہر حیاتیات پروفیسر لوئی بونوغ کے تحقیقاتی مقالے دیکھے ہیں؟ [پروفیسر بونوغ نے نظریہ ارتقاء کے حامی کئی سائنس دانوں سے بحث کی اور تنقید سے اس نظریے کو غلط ثابت کیا تو جواب ملا کہ اس کے باوجود ہم ارتقاء کو ایسا ہی یقینی سمجھتے ہیں گویا کہ اسے معروضی طور پر ثابت کیا جا چکا ہو۔ بونوع نے جواباً لکھا کہ سائنس ہم سے ایمان بالغیب کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ارتقاء کا نظریہ ایک الہامی حقیقت کے لبادے میں پیش کیا جا رہا ہے۔] جواب ملا: جی نہیں۔ ہم نے کہا: کیا ڈگلس ڈیور صاحب کی کتاب *The Transformist IIlusion* نظر سے گزری ہے؟ جواب ملا: جی نہیں۔ پھر ہم نے پوچھا: Evanshute کی کتاب *Flaws in the Theory of Evolution* آپ نے پڑھی ہے؟ جواب ملا: نہیں۔

اس کے بعد ہم نے پوچھا: سائنس کی نئی شاخ Molecular Phylogeny کے بانی کی تحقیقات سے کیا آپ واقف ہیں؟ جواب ملا: اس علم کی شاخ اور موضوع سے ہم واقف نہیں۔ ہم نے کہا: کیا آپ نے جدید علوم کی فہرست، فرہنگ اور تعارفی لغت پڑھی ہے؟ جواب ملا: جی نہیں۔ پھر ہم نے پوچھا: ڈارون کے Life Tree کے بعد ارتقائی سائنس کے میدان میں Life Web, Tangled Tree کی اصطلاحات آئیں، کیا آپ ان سے واقف ہیں؟ کیا آپ Horizontal and Vertical Gene Transfer کے مباحث سے واقف ہیں؟ کہنے لگے: نہیں۔

پھر ہم نے پوچھا: کیا آپ RNA Tie Club کو جانتے ہیں جہاں سال میں دو مرتبہ ۲۰ سائنس داں اکٹھے ہو کر ارتقاء وغیرہ سے متعلق سائنسی مباحث پر تبادلہ خیالات کرتے اور تحقیقات کا ناقدانہ جائزہ لیتے تھے؟ جواب ملا: جی نہیں۔ ہم نے کہا: کیا آپ نے Carl Woese کی تحقیق *The Tangled Tree* پڑھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: مَیں اس

کتاب سے واقف نہیں۔

پھر ہم نے پوچھا: کیا آپ ۲۰۰۴ء میں ۳ بلین ڈالر سے قائم کردہ Human Genom Project سے واقف ہیں جس میں سائنس دانوں نے پہلی مرتبہ 3 billion letters of human genetics code پڑھے تھے جس پر ایک بہت بڑے سائنس دان کا اعتراض تھا کہ بیالوجی کو انجینئرنگ کے ذریعے پرکھا جارہا ہے۔ اور کیا آپ جانتے ہیں کہ Carlowese سائنس دانوں کے Technological Adventurism کے خلاف کیوں تھا؟ اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے جواب دیا: معلوم نہیں۔

ہم نے پوچھا: کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ Woese ڈارون کے بارے میں ہمیشہ لکھتا تھا کہ You accord Darwin so much substance than the bastard deserved اس کے باوجود وہ ڈارون کا مخالف تھا یا حامی اس کی تحقیق کیا نئے راستے دکھاتی ہے یا ڈارون کے راستے کی توسیع وترقی ہے؟ جواب ملا: لاادری۔ پھر ہم نے پوچھا: ڈارون سے لےکر RNA Tie Club تک دوسو سے زائد اہم سائنس دانوں نے، جن میں گیارہ عورتیں بھی شامل ہیں، نظریہ ارتقاء پر کام کیا ہے۔ کیا آپ ان کے ناموں سے اور ان کے کام سے واقف ہیں؟ کیا آپ نے سائنسی اصطلاحات سے متعلق کوئی لغت دیکھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جی نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی حضرت کا فون بند ہوگیا۔

یقین جانیے یہ صورتِ حال صرف ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی نہیں ہے ہر شعبے کا یہی حال ہے۔ ایک مثال اور ملاحظہ کیجیے۔

ہمارے آبائی گھر کے قریب ایک مسجد کے پیش امام صاحب نے ایک بہترین عالم دین کو جو نہایت نیک متقی پرہیزگار، ایک دینی مدرسے میں استاد اور پنجابی، فارسی، فرانسیسی، عربی اور انگریزی پر عبور رکھتے، ہیں، پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں رہنمائی کے لیے ہمارے پاس بھیجا۔ انہیں مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ راقم نے ان کے تحقیقی مقالے کے لیے عالم دین کو ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ وہ مہینے میں صرف ایک دن آدھ گھنٹے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ ان کا موضوع تھا جدید معاشیات اور اسلام۔ راقم نے حضرت سے پوچھا کہ کیا آپ نے معاشیات کی ایمانیات، مابعد الطبیعیات، تاریخ، مباحث، اصطلاحات پر کوئی کتاب پڑھی

ہے؟ جواب ملا: نہیں۔ ہم نے پوچھا: علم معاشیات پر آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ جواب دیا: اُردو میں انٹر کی معاشیات کی کتاب دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے کہا: آپ پی ایچ ڈی کے طالب علم ہیں اور انٹر کی معاشیات کی کتاب سے استفادہ کر رہے ہیں۔ کیا وہ سمجھ میں آتی ہے؟ جواب ملا: بہت مشکل ہے۔ کوئی استاد مل جائے جو ان مباحث کو سمجھا دے تو سہولت ہو جائے گی۔ ہم نے عرض کیا چلیے آپ کے لیے کوئی استاد ڈھونڈتے ہیں لیکن آپ مقالہ کیسے لکھیں گے جب کہ آپ بنیادی مباحث سے ہی واقف نہیں؟ جواب ملا: حضرت میں ایک باب مکمل کر کے جمع کرا چکا ہوں ہمارے سپر وائزر اسے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا باب نصف ہو چکا ہے۔

ہم نے کہا: اچھا یہ بتائیے کہ آپ معاشیات کی اہم اصطلاحات سے واقف ہیں جیسے:

Homo Economicus, Maximizing Individual, Perfect information, Rational being, Scarcity, Unlimited needs, Great Satisfication with minmum efforts, Human behaviour in Economics, Market, Capital, Wealth, Bazar, Free autonomous self intrested individual, Hedonism, Pleasure Seeking Animal, Individualism, Every one is driven by self Intrest, Economic Behaviour, Aims and objects of Market, Civil society, Contractarian Society, Methodological Individualism etc.

حضرت والا نے فرمایا کہ میں ان اصطلاحات سے واقف نہیں۔ وقت بھی کم ہے۔ ان شاء اللہ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد یہ مباحث پڑھ لوں گا۔ ہم نے کہا: جدیدیت اور مغرب کے تمام افکار، عقیدوں، نظریات کو چلانے والا اصل انجن جدید معاشیات ہے لہٰذا آپ کو اس کی مابعد الطبیعیات، ایمانیات، عقائد کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر آپ کی تحقیق مغرب کے نظام سرمایہ داری اور نظام معیشت کو مضبوط کرے گی۔ آپ جزو کی بنیاد پر مغرب کی معیشت کا جائزہ لیں گے اور جزوی مماثلتوں کی بنیاد پر اصول استقراء کے تحت کلیات اخذ کریں گے۔ منطق کا اصول ہے استقرا الیقین کا فائدہ نہیں دیتا۔ خذ ما صفا ودع ما کدر کا اصول یہاں نہیں چلے گا کیوں کہ آپ کے لیے ضروری ہے کہ خُذ سے پہلے جدید معیشت کو تو جانیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ انگریزی جانتے ہیں لہٰذا کتابیں پڑھیں۔ ہم آپ کو کتابیں مہیا

کریں گے فی الحال آپ تین کتابیں دیکھ لیں:

1- A. Smith, *Theory of Moral Centiments*
2- Carl Polyani, *The Great Transformation*
3- G. Rist, *The Delusions of Economics*

جی رِسٹ کی کتاب فرانسیسی میں ہے۔آپ اصل زبان میں کتاب پڑھیے تاکہ اس میں جو فرانسیسی حوالے آئے ہیں ان کا بھی مطالعہ کرسکیں۔انہوں نے جواب دیا: میرے پاس وقت بہت کم ہے۔جلد از جلد مقالہ جمع کرانا ہے۔آپ کتابیں نکالیں، میں دیکھوں گا۔اس کے بعد حضرت والا سے رابطہ منقطع ہوگیا۔کئی سالوں بعد تشریف لائے تو راقم نے پوچھا: آپ کے مقالے کا کیا بنا؟ جواب دیا میں مقالہ جمع نہیں کرا سکا،نگران نے معذرت کر لی، BASR کو کچھ اعتراضات تھے۔اچھا ہوا اس عذاب سے چھٹکارا ملا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کے پی ایچ ڈی کے علمی مقالات اسلامی علمیت کو مضبوط کریں گے یا مغرب کے مسلط کردہ نظریات و نظام کی تصدیق، تائید، توثیق کریں گے؟ ہم نہایت افسوس اور دکھ سے کہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کے اکثر پی ایچ ڈی اسکالرز کی علمی تحقیقات کی سطح یہی ہے جو سطور بالا سے ظاہر ہے۔

امام شامی فرماتے ہیں کہ: "°ll ĈLΣnbânaLý1i ĈLop bu kÿ" یعنی جو شخص اپنے اہل زمانہ سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔اسلامی اکنامکس میں بہت تیزی سے پی ایچ ڈی ہو رہے ہیں۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی بینک میں لاکھوں روپے کی نوکری مراعات کے ساتھ مل جاتی ہے۔مگر افسوس کہ یہ معاشی ماہرین جدید اکنامکس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔مختلف اسلامی بینکوں کے ۱۳ ماہرین سے راقم کو مختلف مواقع پر گفتگو کا موقع ملا مگر اندازہ ہوا کہ یہ حضرت بی اے ایم اے کی سطح سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔مغرب کے علم کی اسلام کاری سے پہلے مغرب کے علوم پر گرفت ہونی چاہیے ورنہ حضرت عمرؓ کا فرمان یاد رہنا چاہیے کہ ”وہ شخص دین کی کڑیاں بکھیر دے گا جو جاہلیت کی حقیقت سے واقف نہ ہو“ ہم جدید اکنامکس کا مطالعہ، انتقاد کرتے ہوئے جو مغرب کی جاہلیت کا تحفہ بلکہ اس کی تہذیب کا انجن ہے، اگر اس کے بنیادی مقدمات، ایمانیات، عقائد، مابعد الطبیعیات، اصطلاحات سے ہی واقف نہیں تو ہم صرف دین کی کڑیاں بکھیرنے کا کام کریں گے۔اللہ ہمیں اس شر سے محفوظ رکھے۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم کی نظریاتی جہت اور اس کے تقاضے

تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کے بغیر چارہ نہیں

کسی بھی قوم اور معاشرے کی بقا اور تسلسل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات کو نظامِ تعلیم کے ذریعے سے نئی نسل کو منتقل کرتا ہے یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ہر زندہ قوم اس بات کا اہتمام کرتی ہے کہ اس کا نظریۂ حیات اس کے نظام تعلیم کے رگ وریشے میں پیوست ہو اور ایک زندہ جاندار کے خون کی طرح اس کے ایک ایک عضو تک پوری قوت اور اجزائے ترکیبی کی فطری نسبت کے ساتھ پہنچے تاکہ قومی زندگی کا ہر پہلو پوری طرح تندرست اور توانا رہے۔ اسلام جو بنی نوع انسان کا فطری، ازلی اور ابدی نظامِ حیات ہے اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ کم ازکم مسلم معاشروں کے قومی نظام تعلیم کی اساس، محوری اور مرکزی فلسفہ اور اس کی تمام جزئیات اس دین برحق کے وسیع البنیاد اصولوں پر مبنی ہوں۔

اسلام علم ودانش کو ایک سمت اور ایک فکر دیتا ہے۔علماء اور طلباء کو سوچنے، سمجھنے اور استنباط کرنے کا ایک انداز عطا کرتا ہے۔مسائل، مشکلات اور لاینحل پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے ایک حکیمانہ صلاحیت عطا کرتا ہے۔تعلیم وتعلم کے معاملے میں فرد اور اجتماعیت کو رہنما خطوط مہیا کرتا ہے۔مدارس اور مکاتب کو ایک مزاج اور ایک شناخت فراہم کرتا ہے۔تعلیم کے ذریعے سے معاشرتی ترقی اور تہذیبی نشوونما کی ایک جہت متعین کرتا ہے اور تعلیم کے میدان میں حقوق وفرائض کا ایک نظام دیتا ہے۔

بدقسمتی سے دورِ حاضر کے بے بصیرت اور غیر مخلص ذہن نے اسلامی نظام تعلیم کا جو نقشہ عوام الناس کے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ نصابات میں اسلامیات کا ایک لازمی یا اختیاری مضمون بڑھا دیا جائے۔قرآن ناظرہ لازمی کر دیا جائے اور اسی طرح کے روبہ عمل نہ آنے والے دیگر نیم دلانہ اقدامات کر دیئے جائیں۔اسلامی نظام تعلیم کے مطالبہ کا جب زور بڑھتا ہے تو اسلامیات کے نصاب میں ذرا اور اضافہ یا اوپر کی زیادہ جماعتوں تک اسلامیات کی لازمی حیثیت بڑھا دی جاتی ہے۔اسلامیات کی تدریس یا قرآن ناظرہ کے لازمی ہونے کی

افادیت اور ضرورت اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اسے زیادہ اہم حیثیت ملنی چاہیے لیکن صرف اتنا کچھ کر دینے سے اور نظام تعلیم کے بنیادی فلسفہ، انتظامی ڈھانچہ اور فراہمی سہولیات وتفریق طبقات کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنے سے اول الذکر اقدامات نہ صرف بے مصرف ہو جاتے ہیں بلکہ نظام تعلیم کی سیکولر اساس اور زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے۔ سیکولرازم یہی تو ہے کہ دین اور دنیا دو علیحدہ خانہ ہائے زندگی ہیں اور انسان دین دنیا کی ثنویت قائم رکھتے ہوئے ہی اپنا وقت گزارے۔ اسلامیات لازمی اور لازمی ناظرہ قرآن کا موجودہ نظام تعلیم میں پیوند سیکولرازم کے حقیقی مزاج کے تسلسل کا باعث ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں دوسری باتوں کے علاوہ قرآن ناظرہ کی بجائے قرآن فہمی اصل مقصود ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن ناظرہ یا حفظ القرآن تو ازخود اس میں شامل ہوگا۔ اسلامیات لازمی کی اصلاح کی بجائے پوری تعلیم وتربیت ہی اسلامی نظام فکر وعمل پر استوار ہوگی اور دین کی بنیادی معلومات ظاہر میں ازخود اس کا حصہ ہوں گی۔ اب آیئے ذرا دیکھیں کہ اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدوخال اور تقاضے کیا ہیں۔

اسلام میں علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔ اسلام ہر طرح کی طبقہ واریت اور متیازی سلوک (Discrimination) کے خلاف ہے۔ اسلام نظام احسان کو ترجیح دیتا ہے۔ دولت کے بہاؤ کا رُخ امیروں سے غریبوں کی طرف کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ تمام مسلمانوں پر لاگو ہوتا ہے۔ اسلام خیر کو بڑھانا اور شر کو مٹانا چاہتا ہے۔ صلاحیت اور سعی کو رفعت انسان کا بنیادی زینہ، تقویٰ وپاکیزگی کو عزت واحترام کی منہاج قرار دیتا ہے۔ اسلام طلب وترویج علم کو عبادت اولیٰ قرار دیتے ہوئے اسے نفلی صلوۃ وصوم سے افضل قرار دیتا ہے۔ اکرام معلم ومتعلم اسلامی تہذیب وتمدن کا درخشاں مینار ہے۔ علم وعمل کی دوئی اسلام میں سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ مسلمانوں کی علمی روایت میں حکمت ودانائی کی تحصیل اور وسیع البنیاد علم کا حصول ایک مرکزی مقصد رہا ہے۔ ہر فرد کے گھر تک علم کی روشنی پہنچانا اسلامی ہیئت حاکمہ نے ہمیشہ اپنے فرائض میں شامل کیا ہے۔ علم کی جستجو میں مارے مارے پھرنا مسلمان طالبان علم کا شیوہ رہا ہے۔ طالبان علم سے معاوضہ وصول کرنا مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ناپید ہے۔ علم کے روشن چراغوں کو ان کی ضروریات زندگی سے بے فکر رکھنے کا فریضہ مسلمانوں کے اجتماعی نظام نے ہمیشہ پورا کیا ہے۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ میں کسی بھی شعبے کا ماہر علم دین سے بے بہرہ نظر نہیں

آ تا۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تحقیق اسلام کی قوت اور دبدبے کے لیے ہمیشہ اہم حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اسلام کے بنیادی عقیدے اور غیر متبدل اساسی اصولوں کے مضبوط لنگر سے بندے رہتے ہوئے کھلا ذہن، سائنسی طرز فکر، آزادانہ تحقیق اور تنقیدی شعور کی نشوونما مسلمانوں کے علمی و تعلیمی فلسفے کا اہم ستون رہا ہے۔ اسلام کا منہاج تعلیم و تربیت نہ ٹیچر سنٹرڈ ہی رہا ہے اور نہ سٹوڈنٹ سنٹرڈ، بلکہ اس کا مرکز ومحور ایسے انسان کی تیاری رہا ہے جو حسنة فی الدین اور حسنة فی الآخرہ کے مقصد کی تکمیل پر قادر ہو۔اسلامی نظام حیات اور تاریخی تناظر میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت سے نظام تعلیم کے لیے جو رہبر خطوط اُبھرتے ہیں ان کا اجمالی نقشہ حسب ذیل ہے:

اسلامی نظام تعلیم کے رہبر خطوط

۱۔ طلب علم کے ضمن میں فرض عین کی حد تک سب شہریوں کے لیے بلا امتیاز یکساں اور مفت تعلیم اور اس کے مقصد کے لیے مسجد کو مرکز تعلیم و تربیت بنانے کا اہتمام۔

۲۔ فرض کفایہ کے احاطہ میں آنے والی تعلیم میں تحصیلی صلاحیت کے اثبات کے بعد سب کے لیے مساویانہ اور عادلانہ مواقع کی فراہمی۔

۳۔ تعلیم کے اہتمام اور فراہمی میں طبقہ واریت کی مکمل نفی۔

۴۔ احترام معلم و متعلم کا اہتمام۔

۵۔ استاد کی مرکزی اور محوری حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ بہترین مردانِ کار کی بطور اساتذہ فراہمی اور تعیناتی۔

٦۔ اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اسلامی کردار کی تشکیل پر زور۔

۷۔ نوجوانوں میں علمی، قلمی، لسانی اور اسلحی جہاد کی صلاحیت اور روح پھونکنے کے لیے موزوں تربیت کا اہتمام۔

۸۔ تعلیمی ادارے کو معاشرتی مرکز مانتے ہوئے اس کے ماحول (سماجی، طبعی، تعلیمی) کی اس طرح تشکیل کہ وہ مثالی اسلامی ماحول کا عکاس اور آئینہ دار ہو۔

۹۔ نظام جائزہ و امتحان میں استاد کو براہ راست بنیادی ذمہ داری دیتے ہوئے اسلامی نظام جزا و سزا کی عکاسی کا اہتمام۔

۱۰۔ طلبہ میں رزق حلال کمانے کی اہلیت کا اہتمام۔

۱۱۔ اسلام اور مسلمانوں کو مادی قوت فراہم کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر خصوصی زور۔

۱۲۔ اعلیٰ سطح کے تعلیمی اداروں میں اجتہادی اور تحقیقی سرگرمیوں کی خصوصی سرپرستی۔

۱۳۔ علوم وفنون کی مادہ پرستانہ سیکولر بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کے فلسفہ علم کے مطابق تشکیلِ نو کے لیے خصوصی تحقیقی اداروں کا قیام۔

۱۴۔ تعلیم وتربیت کے شعبے میں غیر مسلم افراد کے تقرر پر مکمل پابندی۔

تفصیلی جائزہ

ذیل میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس اجمالی نقشہ کا ہم جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے مطابق علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر قسم کا پورے کا پورا علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے بلکہ مسلم ماہرین تعلیم نے اس ضمن میں علم کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ علم کا پہلا درجہ وہ علم ہے جو ہر مسلمان کے لیے مومنانہ زندگی گزارنے کی خاطر اور کائنات خداوندی میں ایک نارمل انسان کی طرح فطرت اور ماحول سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسے جدید اصطلاح میں تعلیم سب کے لیے (Education for All) یا اساسی تعلیم (Basic Education) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ علم کی یہ سطح فرض عین کے زمرے میں آئے گی اور اس کے حصول میں کوتاہی فرض میں کوتاہی شمار ہوگی۔ اس سلسلے میں جہاں فرد انفرادی طور پر اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا ذمہ دار ہے وہاں ہیئت اجتماعی قیام تعلیم وتعلم کا اہتمام کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس کی مثال نماز کی سی ہے کہ نماز ہر فرد کے لیے فرض ہے جبکہ قیام الصلوٰۃ ہیئت اجتماعی کی ذمہ داری ہے۔ جس طرح نماز کے پڑھنے میں استثناء نہیں اسی طرح اس اساسی تعلیم کے حصول اور فراہمی میں بھی استثناء نہیں۔ اس سطح کی تعلیم کا سب شہریوں کے لیے یکساں انتظام اور مفت فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ مسجد مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا وہ مرکز ہے جو ہر جگہ دستیاب ہے۔ مزید برآں مسجد مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا سرچشمہ

ہے۔اس لیے اساسی تعلیم کا اہتمام بھی مسجد کے ساتھ منسلک ہونا چاہیے۔ یہی کم خرچ، آسان اور ہر جگہ دستیاب وسیلہ ہے۔

علم کا دوسرا درجہ وہ ہے جس کا طلب کرنا سب مسلمانوں کے لیے لازمی نہیں ہے لیکن اجتماعی طور پر پورے معاشرے میں مطلوبہ تعداد میں ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جو اس علم کے زیور سے آراستہ ہوں تاکہ معاشرے کی ترقی، نشوونما اور روزمرہ کی سرگرمیوں کے لیے مناسب تربیت یافتہ افراد کی خدمات میسر ہوں اور معاشرے کو کسی بھی تکنیکی خدمت اور ضرورت کے لیے کسی اور معاشرے کا محتاج نہ ہونا پڑے۔علم کا یہ درجہ فرض کفایہ کے زمرے میں آئے گا لیکن چونکہ فرض کفایہ کے تحت آنے والا درجہ علم معاشرے کی اجتماعی ضرورت ہے اس لیے اس کا اہتمام بھی معاشرہ اجتماعی ذمہ داری کی صورت میں کرے گا۔ افراد کے لیے مختلف علوم کے حصول کے دروازے مساویانہ اور عادلانہ بنیادوں پر کھلے ہوں گے۔تفریق اور امتیاز صرف صلاحیت، رجحان طبع اور دلچسپیوں کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ معاشی اور معاشرتی درجے کی بنیاد پر۔ چونکہ معاشرہ اجتماعی طور پر اس درجہ علم کا ضرورت مند ہے لہٰذا اس کی فراہمی بھی اجتماعی بار، اجتماعی طرز پر اٹھانے کی بنیاد پر ہوگی اور افراد جو اہلیت کی بنیاد پر یہ علوم حاصل کریں گے ان پر مصارف کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی۔

۲۔ درج بالا بحث اور اسلام کا عادلانہ نظام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تعلیم کے اہتمام اور فراہمی میں کس طرح کا امتیاز اور طبقہ واریت روا نہ رکھی جائے۔طریق کار میں فرق ہوسکتا ہے لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ طالب علم سے تعلیمی خدمات کے عوض کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ جہاں تعلیم کے حصول میں مالی مصارف کی بات آئے گی وہیں ہر امیر اور غریب میں تفریق شروع ہوگی۔ تعلیمی ادارے نصابات کی علمی سطح اور سہولتوں کی فراہمی کے لحاظ سے اصولاً یکساں ہونے چاہئیں لیکن اگر کسی وجہ سے اداروں میں فرق ہو تو ان میں داخلوں کی بنیاد غیر جانبدارانہ ہونی چاہیے اور ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی سب کے لیے یکساں اور عادلانہ ہونے چاہئیں۔ یہاں یکساں اور عادلانہ کی دونوں اصطلاحیں بیک وقت استعمال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غریب اور امیر، باوسیلہ اور بے وسیلہ، دیہاتی اور شہری، ترقی یافتہ علاقوں کے باسی اور پس ماندہ علاقوں کے باسی سب کے بچوں کے لیے مشترکہ اساس کی بنیاد پر داخلے اور تعلیم جاری رکھنے کے مواقع ہونے چاہئیں۔(جاری ہے)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر پرویز ہود بھائی[۱]

پاکستان میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی بربادی

پاکستان کا پروفیسر مافیا کس طرح تعلیم کو تباہ کر رہی ہے، آیئے دیکھتے ہیں:

ان دنوں پاکستان کے پروفیسرز کے پاس کتب بینی کے لیے بالکل بھی وقت نہیں کیوں کہ وہ اپنا وقت، وہ چیزیں جنہیں وہ ''تحقیقی مقالے'' پکارتے ہیں، چھپوانے میں اور اپنے طلبا کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلوانے میں صرف کر رہے ہیں۔

1973ء میں جب مَیں اسلام آباد یونیورسٹی (جس کا نام بعد میں قائداعظم یونیورسٹی رکھ دیا گیا) میں جونیئر لیکچرر تعینات ہوا، تب وہاں کچھ شعبے متوسط معیار کی امریکی یونیورسٹیوں سے موازنے کے قابل تھے۔ اگرچہ سال بھر میں صرف چند ہی پی ایچ ڈی ڈگریاں عطا کی جاتیں اور ریسرچ پیپرز کا بھی فقدان تھا، لیکن معیار بہتری کی جانب گامزن تھا۔

معیار میں سب سے بڑی گراوٹ 2002ء میں آئی جب تحقیق اور پی ایچ ڈی ڈگریوں کو فروغ دینے کی خاطر ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ترقی، تنخواہوں اور دیگر مراعات کو یونیورسٹی ٹیچرز کے شائع ہونے والے ریسرچ پیپرز کی تعداد سے منسلک کر دیا۔ تدریسی کام نے ایک غیر متعلقہ حیثیت اختیار کر لی۔ آپ کی تنخواہ وہی رہے گی چاہے آپ اچھا پڑھائیں یا برا، یا بھلے ہی آپ اپنے مضمون پر عبور رکھتے بھی ہیں یا نہیں!

دیکھیے کہ کس قدر فروغ حاصل ہوا: 1980-1970ء میں 15 سے 20 سال کے تجربے کے ساتھ ایک فل پروفیسر بننے کے لیے آپ کو 12 ریسرچ پیپرز درکار ہوتے تھے۔ ان دنوں اس تعداد کو خوفناک حد تک کثیر سمجھا جاتا تھا۔ میرے کئی ساتھی بغیر ترقی ملے 60 سال کی عمر تک پہنچ کر ریٹائر ہو گئے۔ وہ بہت ہی بااخلاق، بااصول لوگ تھے جو کتابیں پڑھتے تھے۔

لیکن ایک بار جب لوگوں کو پیسوں سے بھری پوٹلی کی بھنک لگی تو پرانا نظام اور اس کے تمام اخلاق ہی غائب ہو گئے۔ اب کسی کو کوئی حیرانی نہیں ہوتی جب اسی یونیورسٹی میں ایک

---

[۱] سابق پروفیسر قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

طالب علم پی ایچ ڈی کورس کے دوران 10 سے 15 یا اس سے زائد پیپرز شائع کروا دیتا ہے۔ ایچ ای سی کی نئی شرائط نے تعلیمی جرائم کو نفع بخش بنا دیا۔

جس طرح شکاگو میں منشیات فروش گینگز ہوتے ہیں، اسی طرح پاکستانی اعلیٰ تعلیم پر زیادہ تر قبضہ کوسا نوسٹرا جیسے خاندانوں کا ہے۔ ہر مافیا خاندان کا باس اگر مکمل پروفیسر نہیں بھی تو کم از کم ایک ایسوسی ایٹ پروفیسر ضرور ہے۔

ہر باس کے اپنے اپنے ذاتی علاقے مخصوص ہیں تا کہ دیگر باسز سے تنازعات پیدا نہ ہوں، اور ہر باس اس سر پرستانہ کھیل کو بڑے ہی ماہرانہ انداز سے کھیلتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے پاس ایک ماتحت باس (چھوٹا) بھی ہوتا ہے جو فیکٹری مزدوروں، یعنی پی ایچ ڈی اور ایم فل طلبہ کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ فیکٹریاں ایسی جعلی تحقیقیں تیار کرتی ہیں اور ان میں اصل تحقیق کی اس خوب انداز میں پردہ نشینی کر دی جاتی ہے کہ آپ اس نقل کو پکڑ ہی نہیں پاتے۔

لٰہذا حقیقی اساتذہ، جو اپنا پیشہ ورانہ معیار برقرار رکھتے ہیں اور جھوٹ یا فریب سے انکاری ہیں، اس کے تباہ کن اثرات بھگتتے آ رہے ہیں۔ خاص طور پر جب نااہل ساتھی ترقیوں، بے کار پیپرز کی اشاعت کے لیے کثیر مالی معاوضوں کے حصول، انتظامی عہدوں پر ترقی اور قومی اعزازات اور تحائف کے لیے نامزدگی کی ریس میں آگے ہوں تو کئی نوجوانوں کے دل ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس دھوکے بازی کو یونیورسٹی تعلیم سے جڑے افراد کی جانب سے ذاتی طور پر تسلیم بھی کیا جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن اپنی 2002ء کی پالیسی پر پشیمان ہے لیکن یہ ادارہ ان طاقتور مافیاؤں کے خوف کے ہاتھوں مفلوج ہے، جن میں کئی یونیورسٹی وائس چانسلرز، ڈینز، شعبے کے سربراہ، سینیئر اور جونیئر پروفیسرز، پی ایچ ڈی طلبہ، ایچ ای سی ممبران، سائنس کی اکیڈمیاں، علمی تنظیمیں، اور قومی اعزازات جیتنے والے شامل ہیں۔ ان میں سے چند کمیٹیوں کی صدارت کرتے ہیں اور تعیناتیوں اور برطرفیوں کے فیصلے کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری وساری رہے۔

اس جرائم پیشہ گروہ کا اثر پیپرز کے فروغ کے بجائے تدریسی اہلیت کو مضبوط کرنے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ہی یونیورسٹی میں اس کے ایک شعبے کے اندر ہر ایک کے تدریسی معیار کو پرکھنا مشکل ہے۔ مذہبی، مسلکی، نسلی اور دوستیوں کی بنیاد پر ترجیحات سے ایسی سیلیکشنز بے معنی ثابت ہوں گی اور ایک نئی گروہ بندی کو جنم دیں گی۔ اسی طرح یونیورسٹی سطح پر پڑھانے کا

کون اہل ہے اس کا تعین کرنا بھی متنازع ہے۔ بلاشبہ معیار کا کوئی ایک پیمانہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر ایک شعبے سے دوسرے شعبے، اور ہر ایک جگہ سے دوسری جگہ، سوالوں کے جوابات کافی مختلف نوعیت کے ہوسکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی سب سے بہتر جواب نہ بھی ہو، تب بھی اس اہم نکتہ میں شک کی کوئی گنجائش نہیں: ایک پروفیسر وہ چیز نہیں پڑھا سکتا جو نہ اسے پتہ ہے اور نہ ہی جس میں اس کی دلچسپی ہے۔ تدریسی کام کے لیے ایسے انتہائی نااہل افراد کو اداروں سے نکالنے کا کوئی نظام بنایا جانا چاہیے۔

جہاں اینتھراپولوجی یا سائیکولوجی جیسے شعبوں میں 'علمی معیار' کے تعین کا کوئی واضح طریقہ موجود نہیں، وہاں ہارڈ سائنسز کے مضامین میں کم از کم (بنیادی) اہلیت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر استعمال کی جانے والی بہترین نصابی کتب کی ایک کثیر تعداد ہے جس میں ہر ایک باب کے آخر میں پرابلمز اور مشقیں دی ہوئی ہیں، لہٰذا ہم ان کتب کو بروئے کار لاسکتے ہیں۔ ان سوالوں کے مناسب حد تک درست حل کرنے کو علمی معیار پرکھنے کا ایک طریقہ بنایا جاسکتا ہے۔

اس حوالے سے اس سے بھی بہتر دیگر طریقے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً، ہائر ایجوکیشن کمیشن یونیورسٹی سطح پر تدریسی عہدوں کے لیے درخواست دینے والوں کو مناسب ڈسٹینس لرننگ کورسز (MOOCS) کے لیے مطلوب امتحان کو پاس کرنے پر زور ڈالے، جیسے وہ کورسز جنہیں کورسیرا (Coursera)، اسٹینفورڈ یونیورسٹی یا ایم آئی ٹی تیار کرتی ہے۔ بائیومیٹرک چیکنگ اور امتحان کی مناسب نگرانی کے ساتھ یہ طریقہ امیدوار کی اہلیت کو پرکھنے کا ایک سستا، غیر جانبدارانہ اور غیر متعصّبانہ طریقہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مقامی سطح کا کوئی پیمانہ قطعی طور پر استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔

وقت آگیا ہے کہ پاکستان کی یونیورسٹیاں مضحکہ خیز ترجیحات کو تبدیل کرتے ہوئے اس سمت میں جائیں جو ان کی بنیادی ذمہ داری ہے، یعنی پڑھانا۔ زیادہ سے زیادہ ریسرچ پیپرز اور پی ایچ ڈیز کو نفع بخش بنانے سے کرپشن کو فروغ ملا۔ ایچ ای سی کو اپنی اس بے احمقانہ پالیسی کو لازمی طور پر واپس لے لینا چاہیے بھلے ہی پروفیسر مافیا اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے۔

ایسا نہ ہوا تو پھر وہ زمانہ دور نہیں جب پاکستانی یونیورسٹیوں میں دی جانے والی حقیقی ڈگریوں کا معیار بھی ''ایگزیکٹ'' کی ڈگریوں جتنا ہوجائے گا۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

حفظِ قرآن کو بدعت کہنا گمراہ کن ہے

غامدی مکتب فکر کے ڈاکٹر عرفان شہزاد کا مؤقف تجدد کا شاہکار ہے

جاوید غامدی صاحب کے جریدے 'اشراق' کے شمارہ جون ۲۰۱۹ء میں ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ''قرآن مجید کے حفظ کی رسم پر نظر ثانی کی ضرورت'' ہے۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے حفظ قرآن کے موجودہ نظام کو بدعت کہا ہے۔

ہماری رائے میں ڈاکٹر عرفان صاحب نے دو باتوں میں خلط مبحث کیا ہے۔ ایک ہے حفظ قرآن کا وہ نظام جو امت نے پچھلے چودہ سو سال میں ڈویلپ کیا ہے یعنی قرآن حفظ کرنا، اس کے لیے خصوصی مدارس کا قیام یا دینی مدارس میں حفظ کا مخصوص شعبہ قائم کرنا، قرآن حفظ کرنے والے اور کرانے والے کی معاشرے میں تشجیع و تحسین، تراویح میں حفاظ وقراء کا سارا قرآن سنانا اور مقتدیوں کا اہتمام سے اس کا سننا۔ رمضان میں قرآن پڑھنے اور سننے کی تکمیل پر خوشی منانا، حفاظ کی کثرت دیکھتے ہوئے قرآن جیسی بڑی عربی کتاب کے حفظ کو اس کا معجزہ سمجھنا وغیرہ۔ اور دوسرے حفظ قرآن کے اس نظام میں بعض خامیوں اور کمزوریوں کا ہونا۔

پہلا کام شریعت میں مطلوب ہے، اس کے مقاصد کو پورا کرنے والا ہے لہٰذا اس کی تشجیع و تحسین ضروری ہے۔ جو لوگ یہ کام کر رہے ہیں اگر ان کے کام میں کچھ خامیاں کمزوریاں ہیں تو محبت اور نرمی سے ان کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیے تاکہ وہ یہ خامیاں دور کر لیں لیکن مصنف نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ یہ کہ اس نظام میں بعض خامیوں کی وجہ سے حفظ قرآن کے پورے نظام کو غلط اور بدعت قرار دے دیا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل گمراہ کن اور قابل مذمت ہے۔ یہ مسلم معاشرے میں صدیوں سے مروج ایک دینی کام کی تغلیط ہے جو ہر لحاظ سے نقصان دہ ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ لیا: نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹ [الحجر ۹:۱۵] تو اس کے لیے جو اقدامات مطلوب

تھے وہ اس عالم رنگ و بو میں ہونے تھے اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرتے کہ ہم نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے تو ہم اس کے لیے یہ اور یہ اقدامات کریں گے یا مسلمانوں کو علانیہ بتایا جاتا کہ اس کے لیے یہ اور یہ اقدامات کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے حالات پیدا کرنے مقصود تھے کہ قرآن محفوظ رہتا۔ چنانچہ ہم اگر ان حالات پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ابتدائی قدم یہ اٹھایا کہ قرآن حکیم کو نبی کریم ﷺ کے حافظے میں خود اتارا اور آپ کو اسے حفظ کی کوشش کرنے سے بھی منع فرمایا: pTZYZ nVF {}F لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ﴿16﴾ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ﴿17﴾ [القیامہ ۷۵:۱۶، ۱۷]

پھر ہر سال رمضان میں آپ ﷺ جب آخری عشرہ اعتکاف بیٹھتے تو جبریل علیہ السلام کے ساتھ اس سارے قرآن کا دَور کرتے جو اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا اور آپ ﷺ کے وصال سے پہلے جو رمضان آیا اس میں جبریل علیہ السلام نے آپ (ﷺ) کے ساتھ قرآن کے دو دَور کیے [۱] تاکہ قرآن کی آخری اور حتمی صورت آپ ﷺ کے قلب و دماغ میں محفوظ ہو جائے اور آپ اسے امت تک پہنچا دیں۔ پھر آپ ﷺ پر جو قرآن نازل ہوتا وہ آپ کاتبینِ وحی سے لکھوا لیتے اور صحابہ کرامؓ آپ سے سن کر حفظ بھی کر لیتے۔ اس طرح قرآن حکیم کے تحفظ کی صورت بنی۔ حضرت عمرؓ نے تراویح کے لیے جب باقاعدہ نظم قائم کیا تو احادیث میں آتا ہے کہ اس وقت کے امام حضرت ابی بن کعبؓ کو قرآن سنانے کا اور صحابہ کو قرآن سننے کا اتنا ذوق اور اتنا شوق تھا کہ لوگ ساری رات قیام اللیل کرتے اور تب چھوڑتے جب گھروں کو جا کر سحری کھانے کا وقت ہی باقی بچتا۔ [۲]

اب ظاہر ہے کہ اگر امام حافظ نہ ہوتا تو ساری رات قرآن کیسے پڑھتا؟ حضرت عمرؓ نے ایک تو اس طرح تراویح میں حفاظ کے ذریعے قرآن سننے سنانے کا باقاعدہ آغاز کیا اور دوسری طرف جنگِ یمامہ میں حفاظ کی ایک کثیر تعداد کے شہید ہونے سے آپ کو قرآن حکیم کو تحریری صورت میں یکجا کرنے اور محفوظ کرنے کا خیال آیا جس پر حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عمل ہو گیا اور ایک مصحف (مصحف الامام) مرتب کر کے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ کرا دیا

---

[۱] صحیح بخاری: ۴۶۱۴

[۲] موطا امام مالک: ۳۷۹

گیا۔حضرت عثمانؓ نے اسی مصحف کوقرأت قریش کے مطابق مدون کرا کرساری اسلامی مملکت میں بھجوادیا اوراس کے علاوہ دوسرے نسخوں کوختم کرنے کاحکم دیا۔(۱)

اس طرح عہد رسالت اور عہد صحابہ سے لےکرآج تک چودہ سوسال سے امت قرآن کو مدارس میں، مساجد میں اور گھروں میں بلکہ یہاں تک کہ قید خانوں میں اسے حفظ کرتی اور تراویح میں سنتی سناتی چلی آرہی ہے اور ہمیشہ اس کی کتابت اور طباعت کا بھی انتظام کرتی رہی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک الوہی انتظام ہے جواللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لیے مہیافرمایاہے اورمسلمانوں کواس کا ذریعہ بنایاہے۔

اگرمتجدد دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جوکچھ سطور بالا میں عرض کیاہے اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں توہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اگرعہد رسالت اورعہد صحابہ سے لےکرآج تک امت اوراس کے اہل علم کی چودہ سوسالہ قرآن کی زبانی اورتحریری روایت کی، جو بلاشبہ تواتر اور اجماع کی ہرشرط پرپوری اُترتی ہے،اگرکوئی شرعی حیثیت نہیں توان کے پاس اس کی کیاضمانت ہے کہ ان کے پاس قرآن حکیم کا جومتن ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جوحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرنازل ہوا تھا؟ یہ بدنصیب پہلے حدیث وسنت پراعتراض کرتے تھےاوراسے مشتبہ ٹھہراتے تھے،کیااب وہ قرآن کے متن کوبھی مشتبہ ٹھہرانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ وہ خودکو'اہل قرآن' کہلانا پسند کرتے ہیں اوران میں سے ہردانشورقرآن کا مترجم اورمفسر بننا پسند کرتا ہے۔

اہل علم اس پرغورفرمائیں کہ یہ متجددین کیوں سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کواورصحابہ کرامؓ، اسلاف، جمہور علماء، ائمہ اربعہ اورجمہورامت کے اجماع واتفاق کوردّ کرنا اور بےوقعت ٹھہرانا چاہتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح اورتاویل کرسکیں جوان کی پسندیدہ مغربی تہذیب کے اصول واقدار کے مطابق ہو۔فکری افلاس کے مارے ہوئے یہ لوگ مغربی فکروتہذیب کی چکاچوند سے متاثرومرعوب ہوکراسلام کاحلیہ بگاڑنے پرمصرہیں اور بزعم خویش اسے عصری تقاضوں کے مطابق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(۱) صحیح بخاری:۴۹۸۷

ان کے جتنے 'اجتہاد' (؟) اب تک سامنے آئے ہیں ہم ان میں سے ایک ایک کے بارے میں وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ وہ مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہیں۔ انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو البرہان میں ہمارا مضمون ''اسلام اور سیکولرازم۔ جاوید غامدی صاحب کے مؤقف کا ایک جائزہ'' (شمارہ فروری ۲۰۱۵ء) مثلاً یہ لوگ رجم کو اس لیے ردّ کرتے ہیں کہ ان کا آقا مغرب اسے وحشیانہ سزا کہتا ہے بلکہ وہ سزائے موت ہی کی مخالفت کرتا ہے اس لیے یہ کہتے ہیں کہ زانی محصن ہو یا غیر محصن اس کی سزا صرف سو کوڑے ہے۔ مغرب چونکہ زنا بالرضاء کی شناعت کا قائل نہیں اس لیے یہ متجددین بھی اس کی سزا ہلکی سے ہلکی رکھنا چاہتے ہیں اور انہوں نے مشرف سے مل کر ایسی شروط رکھیں کہ اس ہلکی سزا کا ملنا بھی دشوار ہو جائے۔ چونکہ سیکولرزم کہتا ہے کہ ریاست کا مذہب سے کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہیے لہٰذا یہ نیم دانشور بھی کہتے ہیں کہ ''پاکستانی ریاست کا مذہب اسلام ہے'' کہنے کی اور قرارداد مقاصد کی کیا ضرورت ہے؟ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا بھی ان کے نزدیک اسی لیے غلط فیصلہ ہے۔ چونکہ مغرب لبرل ازم میں یقین رکھتا ہے لہٰذا یہ نیم عالم بھی کہتے ہیں کہ دوپٹے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے مسلمان لڑکی کا نکاح جائز ہے۔ لڑکیوں لڑکوں کی آن لائن دوستی میں کوئی ہرج نہیں وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے غامدی مکتب فکر اور تجدد کے ان علمبرداروں کے فتنہ کو بہت ہلکا سمجھا ہے اور ان کا اس طرح علمی تعاقب اور ردّ نہیں کیا جس کے یہ مستحق تھے، جب کہ امریکہ اور اس کے گماشتہ ہمارے حکمران اور حکمران طبقات تو ان کے پشت پناہ ہیں ہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دین کو نہ سمجھنے والے جدید تعلیم یافتہ لوگ اور اباحیت پسند جدید طبقات ہی ان متجددین کے پیروکار نہیں، مساجد اور مدارس سے بھی ان متجددین کے حامی سامنے آرہے ہیں لہٰذا سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کو ان مفسدین کے گمراہ کن نظریات کی مل کر اور مشترکہ طور پر مذمت کرنا چاہیے اور اپنی بات دلائل سے عوام تک پہنچانی چاہیے کہ مغرب کے یہ فکری غلام دین کو منہدم کرنے والے ہیں اور دین کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔

علماء کرام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں خصوصاً جمعہ کے خطبوں میں عوام الناس کو یہ بتائیں کہ حفظ قرآن کو بدعت کہنے والی ان متجددین کی بات بودی

اور غلط ہے اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفظ قرآن کی تحسین و تشجیع فرمائی ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل احادیث پیش نظر رہنی چاہئیں:

۱۔ قرآن سیکھنے اور سکھانے والا سب سے افضل ہے

عَنْ عُثْمَانَ بِنْ عَفَّانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ.(۱)

''حضرت عثمان بن عفانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔''

ظاہر ہے قرآن سیکھنے میں اُس کا یاد اور حفظ کرنا بھی شامل ہے جیسا کہ آج کل کی جدید تعلیم میں بھی ہے۔

۲۔ نماز کی امامت کے لیے حافظ قرآن کو دوسروں پر ترجیح دی جائے

عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: »يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً، فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً، فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً، فَأَقْدَمُهُمْ سِلْمًا، وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ، وَلَا يَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ عَلَى تَكْرِمَتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ.(۲)

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں کی امامت وہ کرائے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا ہو [یعنی قاری اور حافظ ہو]، اگر وہ اس میں یکساں ہوں تو پھر جو سب سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والا ہو، اگر وہ علم حدیث میں بھی یکساں ہوں تو پھر جو سب سے پہلے ہجرت کر کے آیا ہو، اگر ہجرت میں برابر ہوں تو پھر جو سب سے پہلے اسلام لایا ہو۔ کوئی بھی شخص سلطان کی موجودگی میں امامت نہ کرائے اور نہ ہی اس کے گھر میں اس کی خاص مسند پر بیٹھے۔''

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ: »لَمَّا قَدِمَ الْمُهَاجِرُونَ الْأَوَّلُونَ الْعُصْبَةَ ـ مَوْضِعٌ بِقُبَاءٍ ـ قَبْلَ مَقْدَمِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَؤُمُّهُمْ سَالِمٌ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ،

(۱) صحیح بخاری: ۵۰۲۷

(۲) صحیح مسلم: ۶۷۳

وَكَانَ أَكْثَرَهُمْ قُرْآنًا.(۱)

''عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ جس وقت اولین مہاجرین قبا کے قریب عصبہ جگہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے قبل آئے تو ان کی امامت سالم مولیٰؓ ابو حذیفہ کرواتے تھے کیونکہ آپ کو سب سے زیادہ قرآن مجید یاد تھا۔''

۳۔ دنیاوی قیادت وسیادت میں حافظ قرآن کو ترجیح

عَنْ عَامِرِ بْنِ وَاثِلَةَ، أَنَّ نَافِعَ بْنَ عَبْدِ الْحَارِثِ، لَقِيَ عُمَرَ بِعُسْفَانَ، وَكَانَ عُمَرُ يَسْتَعْمِلُهُ عَلَى مَكَّةَ، فَقَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْتَ عَلَى أَهْلِ الْوَادِي، فَقَالَ: ابْنَ أَبْزَى، قَالَ: وَمَنِ ابْنُ أَبْزَى؟ قَالَ: مَوْلًى مِنْ مَوَالِينَا، قَالَ: فَاسْتَخْلَفْتَ عَلَيْهِمْ مَوْلًى؟ قَالَ: إِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَإِنَّهُ عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ، قَالَ عُمَرُ: أَمَا إِنَّ نَبِيَّكُمْ ﷺ قَدْ قَالَ: «إِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا، وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ».(۲)

حضرت عامر بن واثلہؓ کہتے ہیں کہ نافع بن عبد الحارثؓ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو عسفان میں ملے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مکہ کا گورنر مقرر کیا ہوا تھا، تو آپ نے ان سے پوچھا: اہل وادی پر کسے سربراہ مقرر کیا ہے؟ نافع نے کہا: ابن ابزی کو! حضرت عمرؓ نے کہا: وہ کون ہے؟ نافعؓ نے کہا: وہ ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے! حضرت عمرؓ نے کہا: تم نے غلام کو ان کا سربراہ بنا دیا ہے؟ نافعؓ نے کہا: وہ قرآن کا قاری وحافظ ہے اور انہیں فرائض [وراثت] کا علم بھی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: تمہارے نبی نے [سچ] کہا ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ اس کتاب کی وجہ سے کچھ لوگوں کو عزت سے نوازتا ہے اور کچھ کو ذلت سے۔''

۴۔ حافظِ قرآن رحمتِ الٰہی کے سائے میں

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: .... وَمَا قَعَدَ قَوْمٌ فِي مَسْجِدٍ يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ، إِلاَّ نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلاَئِكَةُ.(۳)

---

(۱) صحیح بخاری: ۶۹۲

(۲) صحیح مسلم: ۸۱۷

(۳) جامع ترمذی: ۲۹۴۵

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو لوگ مسجد میں بیٹھ کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں اُسے سیکھتے سکھاتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انہیں گھیرے میں لے لیتے ہیں۔''

۵۔ قرآن مجید کی تعلیم کو مہر مقرر کرنا جائز ہے

عن سهل بن قال: أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ امْرَأَةٌ، فَقَالَتْ : إِنَّهَا قَدْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ ، فَقَالَ : مَا لِي فِي النِّسَاءِ مِنْ حَاجَةٍ، فَقَالَ رَجُلٌ : زَوِّجْنِيهَا، قَالَ : أَعْطِهَا ثَوْبًا، قَالَ : لَا أَجِدُ، قَالَ : أَعْطِهَا وَلَوْ خَاتَمًا مِّنْ حَدِيدٍ، فَاعْتَلَّ لَه،، فَقَال : مَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ : كَذَا وَكَذَا، قَالَ : فَقَدْ زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآن.[۱]

''ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئی کہ میں نے خود کو اللہ اور اس کے رسول کے لیے وقف کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے شادی میں رغبت نہیں ہے۔ ایک صحابی کہنے لگے: میرا نکاح اس سے کروا دیں! آپ ﷺ نے فرمایا مہر میں اسے کپڑے لا دو، وہ کہنے لگا: مجھے کپڑوں کی استطاعت نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کچھ ہی دے دو، خواہ لوہے کا چھلا ہی ہو۔ اس آدمی نے اپنے افلاس کا عذر پیش کیا آپ ﷺ نے پوچھا: کچھ قرآن یاد ہے؟ کہنے لگا: جی ہاں، فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان سورتوں کی تعلیم کے عوض مَیں نے تمہارا نکاح اس خاتون سے کر دیا۔''

۶۔ تدفین میں حافظ قرآن کو ترجیح

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ احد کے دن جان نثاروں کو ایک ایک کپڑے میں کفن دیتے اور پھر فرماتے: ان میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد تھا؟ پس جب کسی کے بارے میں اشارہ کیا جاتا تو اسے لحد میں پہلے اتارتے۔ اور پھر فرمایا: مَیں روز قیامت ان سب کا گواہ ہوں، آپ نے جان نثاروں کو ان کے خون کے ساتھ

---

[۱] صحیح بخاری: ۵۰۲۹، صحیح مسلم: ۱۴۲۵

عسل دیئے بغیر دفن کیا اور ان کی نماز جنازہ ادا نہیں فرمائی۔ (۱)

۷۔ حافظ قرآن کے اعلیٰ درجات

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يُقَالُ، يَعْنِي لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ،: اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَإِنَّ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُ بِهَا. (۲)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ: ''صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتے جاؤ اور جنت کے درجات چڑھتے جاؤ نیز اسی طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھو جیسے تم دنیا میں پڑھتے تھے اور تمہارا ٹھکانا وہیں ہوگا جہاں تم آخری آیت پڑھو گے۔''

ظاہر ہے اس حدیث میں ''صاحب قرآن'' اور ''پڑھتا جا اور چڑھتا جا'' کا مصداق وہی ہوسکتا ہے جسے قرآن حفظ ہو۔

۸۔ حافظِ قرآن فرشتوں کا ہمراہی

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: »الْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ، وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ، لَهُ أَجْرَانِ« (۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس شخص کی مثال جو قرآن کا ماہر ہو (یعنی اس کی قرأت وتجوید وتحفیظ میں ماہر ہو) تو وہ نیک محرر فرشتوں کے ہمراہ ہوگا۔ اور جو شخص قرآن پڑھنے کی کوشش کرے لیکن یہ اس کے لیے مشکل ہو تو اس کے لیے دہرا اجر ہے۔''

۹۔ آخرت میں حافظ کو معزز تاج اور مکرم لباس پہنایا جائے گا

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يَجِيءُ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ حَلِّهِ، فَيُلْبَسُ تَاجَ الْكَرَامَةِ، ثُمَّ يَقُولُ: يَا رَبِّ زِدْهُ، فَيُلْبَسُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ، ثُمَّ

(۱) صحیح بخاری: ۱۲۷۸

(۲) جامع ترمذی: ۲۹۱۴

(۳) صحیح مسلم: ۷۹۸

يَقُولُ: يَا رَبِّ ارْضَ عَنْهُ، فَيَرْضَى عَنْهُ، فَيُقَالُ لَهُ: اقْرَأْ وَارْقَ، وَيُزَادُ بِكُلِّ آيَةٍ حَسَنَةً.(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کریم قیامت کے دن آ کر کہے گا: پروردگار! قرآن کے قاری اور حافظ کو مزین فرمادے، تو اسے معزز تاج پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن کہے گا: یارب! مزید مزین فرمادے، تو پھر اسے مکرم لباس پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن کہے گا: یارب! اس سے راضی ہو جا، تو اسے کہا جائے گا: پڑھتا جا چڑھتا جا اور ہر آیت کے پڑھنے پر اس کا حسن دوبالا ہوتا جائے گا۔''

۱۰۔ قرآن آخرت میں قاری اور حافظ کی شفاعت کرے گا

أَبُو أُمَامَةَ الْبَاهِلِيُّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، يَقُولُ: »اقْرَءُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِأَصْحَابِهِ، اقْرَءُوا الزَّهْرَاوَيْنِ الْبَقَرَةَ، وَسُورَةَ آلِ عِمْرَانَ، فَإِنَّهُمَا تَأْتِيَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ، أَوْ كَأَنَّهُمَا غَيَايَتَانِ، أَوْ كَأَنَّهُمَا فِرْقَانِ مِنْ طَيْرٍ صَوَافَّ، تُحَاجَّانِ عَنْ أَصْحَابِهِمَا، اقْرَءُوا سُورَةَ الْبَقَرَةِ، فَإِنَّ أَخْذَهَا بَرَكَةٌ، وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ، وَلَا تَسْتَطِيعُهَا الْبَطَلَةُ« قَالَ مُعَاوِيَةُ: بَلَغَنِي أَنَّ الْبَطَلَةَ: السَّحَرَةُ.(۲)

ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے: ''قرآن پڑھو؛ کیونکہ یہ قرآن اپنے پڑھنے والوں کے لیے روزِ قیامت سفارشی بن کر آئے گا، تم زہراوین یعنی سورہ بقرہ اور آل عمران پڑھو یہ روزِ قیامت آئیں گی گویا کہ یہ دو بادل ہیں یا دو سائبان ہیں یا اڑنے والے دو پرندوں کے جھنڈ ہیں۔ یہ اپنے پڑھنے والے کے لیے تکرار کریں گی۔ تم سورہ بقرہ کی تلاوت کرو؛ کیونکہ سورہ بقرہ کی تلاوت باعث برکت ہے، اسے چھوڑنا باعث حسرت ہے اور جادوگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

۱۱۔ وہ سینہ ویرانہ ہے جس میں قرآن نہ ہو

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ، عَنْ قَابُوسَ بْنِ أَبِي ظَبْيَانَ، عَنْ

---

(۱) جامع ترمذی: ۲۹۱۷

(۲) صحیح مسلم: ۸۰۴

أَبِيهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: »إِنَّ الَّذِي لَيْسَ فِي جَوْفِهِ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ«.﴿۱﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کے سینے میں قرآن کا کچھ حصہ نہ ہو (یعنی جسے قرآن بالکل یاد نہ ہو) وہ ویران گھر کی طرح ہے۔''

۱۲۔ حافظِ قرآن کے والدین کا اعزاز

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ السَّرْحِ، أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، عَنْ زَبَّانِ بْنِ فَائِدٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ الْجُهَنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: »مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهَذَا«﴿۲﴾

معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہوگی جو تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمہارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہوگا۔''

ان احادیث سے ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام نے حفظ قرآن کی تحسین و تشجیع کی ہے اور حفظ قرآن کی ایک شرعی حیثیت ہے اور اس کی دینی لحاظ سے ایک اہمیت ہے جس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

تعلیمی لحاظ سے حفظِ قرآن کا مفید ہونا

مصنف متجدد صاحب نے مسلمانوں میں حفظ قرآن کے رواج کی تغلیط کرتے ہوئے یہ

﴿۱﴾ سنن ترمذی: ۲۹۱۳ و سنن الدارمی: ۳۳۰۹، (ضعفہ النسائی وزبیر علی زئی)

﴿۲﴾ سنن ابی داؤد ۱۴۵۳، صححہ الحاکم علی شرط مسلم ووافقہ، ورواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط، ۴:۵۱ (ضعفہ الالبانی وزبیر علی زئی)

بھی کہا ہے کہ یہ طلبہ پر ناروا بوجھ ہے، ان کو رٹّے کا عادی بناتا اور فہم متون سے دور کرتا ہے اور ایسے طلبہ اپنے ساتھیوں سے تعلیمی لحاظ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہمارا تعلق چونکہ تعلیم کے شعبے سے ہے اور عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاہی میں، لہٰذا ہم اپنے مشاہدے اور تجربے کی بناء پر عرض کرتے ہیں کہ مصنف کا موقف غلط اور کمزور ہے۔ نفسیاتی اور سائنسی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے جن قویٰ کو زیادہ استعمال کرے ان کی صلاحیت وقوت بڑھتی جاتی ہے، نہ کہ کم ہوتی ہے۔ مثلاً علم تقسیم کرنے اور پڑھانے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ جو بچے قرآن حفظ کرتے ہیں وہ عموماً ذہین اور محنتی ہوتے ہیں (کہ غیر ذہین اور غیر محنتی بچہ قرآن حفظ کر ہی نہیں سکتا)۔ قرآن یاد کرنے کی مہم میں ان کا حافظہ (Memory) ترقی کرتا ہے اور مزید تیز ہو جاتا ہے۔ انہیں چیزوں کو یاد اور ذہن وقلب میں محفوظ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یوں وہ دیگر مضامین کے فہم و تعلم میں بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عام لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ محض قیاس آرائی اور توہم ہے کہ حفظ کرنے والے بچے عام تعلیم میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں بلکہ حقیقی صورت حال اس کے برعکس ہے کہ حافظ بچے دوسرے مضامین میں دوسروں سے بہتر کارکردگی کا مظاہر کرتے ہیں۔

موجودہ نظام حفظ کی بعض خامیاں

حفظ قرآن کی ضرورت واہمیت اور شرعی حیثیت بیان کرنے کے بعد ہمیں یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے حفظ قرآن کے نظام میں بعض خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں اور ہم علماء کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں غور فرمائیں اور ان خامیوں کو دور کر کے حفظ قرآن کے نظام کو مزید مؤثر اور مفید بنائیں۔ چند خامیاں یہ ہیں (جن میں سے بعض کا ذکر مصنف نے بھی کیا ہے):

❁ ہمارے معاشرے میں حفظ قرآن کا رجحان خوش کن ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری زندگیوں میں اور ہمارے نظام تعلیم اور درسیات میں قرآن حکیم کو وہ اہمیت حاصل نہیں جس کا یہ مستحق ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے قرآن کا دامن تھاما تو عروج پایا اور اسے چھوڑا تو زوال کی گہرائیوں میں جا گرے۔ ہمارا جدید نظام تعلیم قرآن کے

نور سے بڑی حد تک محروم ہے اور درس نظامی میں بھی سب سے زیادہ وقت عربی زبان کو دیا جاتا ہے، اس کے بعد حدیث کو اور اس کے بعد قرآن کی باری آتی ہے۔ اسی طرح بہت سے مدارس میں ہمیں 'شیخ القرآن' کا منصب خالی ملتا ہے۔ حالانکہ خود قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ [الاسراء۱۷:۹] ''اور یہ کہ قرآن آخرت میں استغاثہ کرے گا کہ مسلمانوں نے اسے پس پشت ڈال رکھا تھا۔'' ﴿اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ [الفرقان ۲۵:۳۰]

اور حدیث میں آتا ہے کہ: ''جس قوم نے قرآن کا دامن تھاما تو عروج پایا اور جس نے اسے چھوڑا وہ ذلیل ہوا۔'' (۱)

❁ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ قرآن کتابِ عمل ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اس لیے نازل کیا ہے کہ ہم اس پر عمل کریں لیکن ہمارے ہاں بہت سے لوگ قرآن حفظ کر لیتے ہیں لیکن اس کا ترجمہ نہیں سیکھتے، عربی نہیں پڑھتے اور نہ اساتذہ اور مدارس اس کا اہتمام کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ طلاب فہم قرآن سے عاری رہ جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے جو قرآن کو سمجھتا ہی نہیں کہ اس میں کیا لکھا ہے، وہ اس پر عمل کیا کرے گا؟

❁ اسی طرح بعض لوگ قرآن حفظ کر لیتے ہیں لیکن وہ تجوید نہیں سیکھتے اور قرآنی الفاظ کی صحیح ادائی نہیں کر سکتے۔

❁ بعض والدین بچوں کو قرآن حفظ کرا دیتے ہیں لیکن گھر کا ماحول مذہبی نہیں ہوتا اور نہ یہ بچے تراویح میں قرآن سناتے ہیں۔ یوں بچوں کو قرآن بھول جاتا ہے، نہ وہ اسے اہمیت دیتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت وعید موجود ہے۔

❁ حفظ قرآن کے بعض مدارس میں بچوں کو مار مار کر قرآن حفظ کرایا جاتا ہے اور بہت سے قراء اساتذہ اس پر اصرار کرتے ہیں اور اس کا جواز پیش کرتے ہیں۔

اگر مدارس کے مہتمم حضرات اور قرآن حفظ کرانے والے اساتذہ کرام ہماری ان گزارشات پر غور فرمائیں تو حفظ قرآن کے نظام کو مزید مفید اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم: ۸۱۷

فہم دین ڈاکٹر محمد امین

قرآن حکیم کی بعض اہم اصطلاحات

نفس، قلب، روح، عقل (اور دماغ) میں کیا فرق ہے؟

برادر سلیم طارق لون صاحب (ریٹائرڈ آئی جی پولیس، اسلام آباد) نے ہمیں چند سوالات بھجوائے جو مطالعہ قرآن حکیم کے دوران ان کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ ویسے ہمیں لون صاحب کی یہ ادا پسند آئی کہ وہ اپنے آپ کو قرآن حکیم کا طالب علم سمجھتے ہیں اور جس بات کی سمجھ نہ آئے، اہل علم سے پوچھتے ہیں اوران کم سوادریٹائرڈ سول سروس افسران کی طرح نہیں ہیں جو ریٹائرمنٹ کے بعد، جب کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا، تو اسلام پر چند کتابیں پڑھتے ہیں اور پھر 'عالم' اور 'مفسر' بن بیٹھتے ہیں۔ یہ سوالات ہم نے البرہان کے شمارہ 'جون ۲۰۱۹ء' میں شائع کر دیے تاکہ البرہان کے فاضل قارئین میں سے کوئی صاحب لون صاحب کی تشفی کر دیں۔ اس کے جواب میں ہمیں دو مضامین موصول ہوئے جو البرہان کی ایڈیٹوریل کمیٹی کو پسند نہ آئے اور شائع نہ ہو سکے۔ مجھے پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے کہا: آپ خود کیوں نہیں لکھ دیتے؟

اب میرا احساس یہ تھا کہ موضوع اہم ہے اور اس کے لیے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے جس کے لیے وقت اور محنت درکار ہے جو مختلف اسباب وعوارض کی بناء پر مجھے فی الحال میسر نہیں چنانچہ پچھلا ماہ اسی شش و پنج میں گزر گیا۔ اس دفعہ سوچا کہ اگر نئے مطالعہ و تحقیق کا وقت نہیں تو سابقہ مطالعے اور اس کا جو حصہ یادداشت میں محفوظ ہے، اس کی بنیاد پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن بارے دگر ہم ان اہل علم سے درخواست گزار ہیں جن کا اس موضوع کا اختصاصی مطالعہ ہے کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں، ہم بخوشی ان کی تحریر کو البرہان میں جگہ دیں گے۔

قلب، عقل اور دماغ

قرآن حکیم کی کئی آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت سی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ

انسانی تفکر و تعقل اور اعمال کا دار و مدار جس قوت/فیکلٹی/عضو پر ہے وہ 'قلب' ہے یا بعض جگہ اس کا مترادف لفظ 'فواد' استعمال ہوا ہے۔ 'دماغ' عربی لفظ ہے لیکن قرآن و حدیث میں بطور اسم ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا کہ یہ کوئی ایسی قوت/فیکلٹی/عضو ہے جو انسانی تفکر و تعقل کا مرکز اور اس کے اعمال کا منبع ہے۔ یہ بطور فعل صرف ایک دفعہ قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے u'YzoZ lnsyVa یعنی وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے۔ عقل بھی عربی لفظ ہے یہ بھی قرآن حکیم میں بطور اسم استعمال نہیں ہوا بلکہ بطور فعل (یَعْقِلُوْنَ، تَعْقِلُوْنَ، نَعْقِلُ وغیرہ) استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے عقل سمجھ سے کام لینا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ہم ایک بات کی وضاحت کر دیں جو ہمارے ہم عصر ذہن کے لیے بہت ضروری ہے کہ جو بات قرآن و سنت میں واضح الفاظ میں کہہ دی جائے وہ حتمی طور پر درست ہوتی ہے، حق ہوتی ہے، سند ہوتی ہے۔ اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا اور نہ یہ اسے زیبا ہے کہ وہ اس کی حقانیت پر سوال اٹھائے، خواہ وہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم علمی روایت میں کبھی کسی عالم، مفسر، محدث، فقیہ، متکلم نے قلب کی اس حیثیت پر کہ وہ منبع تفکر و تعقل ہے اور اس پر اعمال کا دار و مدار ہے، کبھی کوئی سوال نہیں اٹھایا، کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اسے تسلیم کیا ہے اور مسلم ماہرین تزکیہ نفس (محقق صوفیاء) نے اس اصولی بنیاد پر افکار و مناہج کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی ہے اور تعمیر و اصلاحِ شخصیت اور تزکیۂ نفس میں قلب کی فعلیت اور کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

دراصل جو تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے وہ وحی کو منبع عالم نہیں مانتی اور عقل پرستانہ ہے یعنی اس میں تفکر و تعقل اور انسانی اعمال کا دار و مدار عقل انسانی پر ہے اور اس تہذیب اور اس کی سائنس کے نزدیک عقل کا محل دماغ ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اس پر کوئی تبصرہ کریں ہماری رائے میں یہاں ایک اور اصولی بات کا استحضار ضروری ہے اور وہ یہ کہ سائنس کا کوئی نظریہ یقینی اور حتمی نہیں ہوتا اور نہ یہ مذہب اور وحی کے مقابلے کی کوئی چیز ہے۔ مذہب انسان کو ان بنیادی سوالوں کا حتمی جواب دیتا ہے جن کا تعلق نفس انسانی کی ماہیت، فعلیت اور کردار سے ہے، جسے آج کل ورلڈ ویو کہا جاتا ہے (یعنی

تصور انسان، تصور الٰہ اور تصور کائنات اور یہ کہ کائنات میں انسان کا کردار کیا ہے اور اس کے تعلقات الٰہ، کائنات اور دوسرے انسانوں کے ساتھ کیسے ہونے چاہئیں اور کن اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں؟) سائنس کا ان سوالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ ان امور کے بارے میں کوئی حتمی جواب دیتی ہے اور نہ دے سکتی ہے۔ اس کا دائرہ کار کائنات کو سمجھنا، اس میں تصرف اور اس کے لیے نظریہ سازی ہے۔ چونکہ اس چیز کا انحصار انسانی عقل و تجربات پر ہے لہٰذا عقل کے حاصلات (Findings) کبھی حتمی نہیں ہوتے، ان کی تصحیح ہوتی رہتی ہے اور وہ امپرو و (Improve) ہوتے رہتے ہیں۔ بعض مغربی دانشور اور فلاسفر عقل کی نارسائی کو چھپانے (Cover کرنے) اور اپنے نظریات کو محکم باور کرانے کے لیے اپنے ہاں کے سائنسی نظریات کو ریاضی کی مثل حتمی قرار دینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی محدودیت (Limitations) کا برملا اقرار کرتے ہیں اور مذہب کی اہمیت، افادیت اور حتمیت کو مانتے بھی ہیں۔ ڈارون، فرائڈ، میکڈوگل، کارل مارکس وغیرہ کے نظریات نہ تو سائنٹفک حقائق ہیں اور نہ حتمی اصول ہیں اور خود مغرب کے کئی فلاسفر اور سائنس دان دلائل سے ان کے نظریات کو غلط ثابت کرتے ہیں۔

ہم قارئین کی دلچسپی کی خاطر ایک واقعہ یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ راقم ۱۹۷۸ء میں ریاض یونیورسٹی سے فقہ واصول فقہ میں ایم فل کر رہا تھا تو ایک دفعہ ایک بڑا سیمینار ہوا جس کی صدارت معروف عالم دین اور مملکت کے چیف مفتی علامہ عبداللہ بن عبدالعزیز بن بازؒ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں موضوع کی مناسبت سے کہا کہ قرآن وسنت کی تعلیمات یقینی طور پر صحیح اور حتمی ہوتی ہیں جبکہ سائنس کے نظریات حتمی نہیں ہوتے اور اس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اکثر سائنس دان کہتے ہیں کہ زمین گول ہے حالانکہ یہ بات بداہتاً غلط ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اگلے چند منٹوں میں زمین کے چپٹا ہونے کے حق میں کئی دلائل دیے۔ ان کی تقریر سن کر یونیورسٹی کے دوسرے طلبہ کی طرح مَیں بھی پریشان ہو گیا کہ یہ عجیب دقیانوسی مولوی صاحب ہیں کہ سائنس ثابت کرتی ہے کہ زمین گول ہے اور یہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ زمین گول نہیں چپٹی ہے۔ چنانچہ سوال و جواب کے سیشن میں ایک سعودی طالب علم نے یہی سوال علامہ صاحب سے کیا کہ ہم سکولوں کالجوں میں سائنس کی کتابوں میں

پڑھتے ہیں کہ زمین گول ہے جب کہ آپ فرمارہے ہیں کہ وہ گول نہیں چپٹی ہے۔ تو انہوں نے اپنی بات دہرائی اور زور دے کر کہا کہ یہ محض ایک سائنسی نظریہ ہے کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ اس نظریہ کے حامی جو دلائل دیتے ہیں مجھ ان میں کوئی وزن نظر نہیں آتا۔ راقم کئی دن خلجان میں مبتلا رہا، پاکستانی ساتھیوں سے بھی اس موضوع پر بات ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ موضوع زندگی کی دوسری مصروفیات میں گم ہو گیا اور اس پر مزید سوچنے اور مطالعہ وتحقیق کا موقعہ نہ ملا۔ ۱۹۸۶ء میں راقم واپس پاکستان آ گیا۔ یہ غالباً ۱۹۹۸ء کی بات ہے کہ روٹین میں علی الصبح نوائے وقت آیا اور اسے دیکھتے ہوئے میری نظر اندر کے ایک صفحے پر پڑی جس میں ایک مغربی ملک کی نیوز ایجنسی کی طرف سے مختصر سی خبر تھی کہ بہت سے سائنسدانوں نے جدید تحقیقات کے بعد اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ زمین پوری طرح گول نہیں ہے بلکہ کچھ چپٹی سی ہے۔ سبحان اللہ! مَیں ہکا بکا رہ گیا اور مجھے بے اختیار علامہ بن بازؒ یاد آ گئے۔ میں نے اخبار کی کٹنگ سنبھال کر رکھ لی اور اب بھی میرے کاغذوں میں کہیں پڑی ہوگی۔ یہی حال سیاروں، تخلیق کائنات، کشش ثقل اور دوسرے سائنسی نظریات کا ہے کہ یہ محض علمی نظریات ہیں ثابت شدہ حتمی حقائق نہیں ہیں۔..... لیکن ہمارے ذہن چونکہ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہیں لہٰذا ہم ان کے ہر کہے کو سائنس کے نام پر مستند سمجھنے لگتے ہیں۔

تو ہم یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ یہ سمجھنا کہ تعقل وتفکر کا محل دماغ ہے اور وہی ہمارے افعال کو کنٹرول کرتا ہے، محض ایک سائنسی نظریہ ہے کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ قرآن وحدیث اور محقق صوفیاء نے قلب کی فعلیت اور کردار کے بارے میں جو کہا ہے، جدید مغربی تحقیقات نے اس کو سچ ثابت کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں کیلیفورنیا کے Heart Math Institute اور دوسرے تحقیقی مراکز میں جو تازہ ترین تحقیقات ہو رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہارٹ (Heart) کے اندر اس کا اپنا انڈی پنڈنٹ دماغ بھی ہے اور اس کا ایک میموری سیکشن بھی ہے اور یہ کہ قلب کا دماغ اور دمیغ سے ہر وقت اعصابی رابطہ بھی رہتا ہے اور یہ کہ بہت سے امور میں (خصوصاً جذباتی امور میں جیسے محبت وخوف وایمان وغیرہ) قلب خود آزادانہ فیصلے کرتا ہے نیز وہ دماغ کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جس کا زیادہ تر کام حسوں سے موصول ہونے والے معلوماتی سگنلز کو پڑھنا اور مرتب کرنا ہوتا ہے۔ امریکہ میں مقیم

پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر مشتاق گوہر نے چند سال پیشتر اس موضوع پر تحقیق کی۔ان کی کتاب The Intelligent Heart, The Pure Heart لندن سے شائع ہوئی۔انہوں نے اپنے انگریزی مضامین کا خلاصہ اپنی اردو تحریروں میں بھی شامل کر دیا ہے جو خواتین ڈائجسٹ منصورہ نے شائع کی ہیں۔ ہم نے ان کی مہیا کردہ معلومات کو مرتب کر کے ۲۰۱۰ء میں البرہان کے شمارہ اگست تا نومبر ۲۰۱۰ء میں شائع کیا تھا (یاد رہے کہ البرہان کے شمارے انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔)

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مہتم بالشان موضوع ہے جو علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کے لیے مناسب ہے کہ قلب کے بارے میں قرآن وحدیث اور محقق صوفیاء کی تصریحات اور اس پر مغرب میں ہونے والی جدید ریسرچ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ہمیں یقین ہے کہ اس کے نتیجے میں قرآن وحدیث کے اس موقف کو ثابت کیا جاسکے گا کہ تعقل وتفکر کا محل قلب ہے نہ کہ دماغ۔

جو لوگ اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں انہیں چاہیے کہ قرآن وحدیث اور ان کی شروح کے علاوہ محقق صوفیاء کے کام خصوصاً قشیری کے الرسالہ، ابو طالب مکی کی قوت القلوب، الطوسی کی کتاب اللمع، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، حضرت علی ہجویریؒ کی تصانیف، کتب اخلاق اور ماضی قریب کے مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ذوقی کی 'سِرّ دلبراں' کا مطالعہ ضرور کریں جو تصوف کی اصطلاحات کی ایک عمدہ ڈکشنری ہے۔مغرب میں ہارٹ پر ہونے والی تازہ ترین تحقیقات کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے اور سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے مغربی تحقیقات تک رسائی بھی کوئی مشکل امر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو خود اس موضوع پر لیبارٹری ریسرچ کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے محققین، یونیورسٹیوں، حکمرانوں اور مخیر حضرات کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ہمیں خود اس موضوع سے دلچسپی ہے اور ہمارے پی ایچ ڈی کے دوسرے مقالے ''تعمیر واصلاح شخصیت کا متوازن تصور۔ اسلام اور مغربی تہذیب میں تقابلی مطالعہ'' میں جسے اُردو سائنس بورڈ نے 'اسلام اور تزکیۂ نفس' کے نام سے طبع کر دیا ہے، ضمناً اس کا ذکر بھی ہوا ہے۔لیکن دعوتی وعلمی ترجیحات نے ہمیں اس موضوع پر مزید مطالعہ وتحقیق کا موقع نہیں دیا (جاری ہے)

فہم دین　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مدیر

مرسیؒ کی شہادت ۔ سبق کیا ہے؟

جدید دینی تحریکوں کی حکمتِ عملی

سوال یہ ہے کہ اگر جدید دینی تحریکیں ماضی کے تجربات کے پیشِ نظر سابقہ سیاسی ودعوتی حکمت عملی پر نظر ثانی کر سکتی ہیں تو ان کی کم وبیش ایک صدی کی جدوجہد کے نتائج دیکھ کر ان کی حکمت عملی پر نظر ثانی کیوں نہیں کی جانی چاہیے؟

مرسیؒ کی شہادت پر فوری ردّعمل تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ اخوان پر مظالم کی مذمت کی جائے، ان کی قربانیوں کو سراہا جائے اور راہِ حق میں قربانیاں دینے کا عزم کیا جائے....لیکن کچھ باتیں ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کی بھی ہیں۔ اس وقت اس موضوع پر کوئی طویل اور مدلل گفتگو ہمارے پیش نظر نہیں، ہم صرف ایک بنیادی فکری سوال اٹھانا چاہتے ہیں تاکہ وہ جو عقل وشعور رکھتے ہیں، اس سوال پر غور کریں اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

سوال یہ ہے کہ جمہور امت جس سیاسی ودعوتی حکمت عملی پر گامزن تھی، ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمے کے بعد جدید دینی تحریکوں کے قائدین نے اس پر نظر ثانی کی اور نئی حکمت عملی وضع کی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو حکمت عملی انہوں نے وضع کی اب اس پر تقریباً ایک صدی ہونے کو ہے اور ان کی اس سو سالہ جدوجہد کے جو نتائج نکلے ہیں وہ بھی ہمارے سامنے ہیں تو ان کی وضع کردہ حکمت عملی اور اس کے نتائج کا تجزیہ کرنے میں کیا مانع ہے؟ اور اگر ضرورت ہو تو ان کی اختیار کردہ حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے یا نئی حکمت عملی وضع کرنے میں کیا ہرج ہے؟

اگرچہ ہمارا اٹھایا ہوا سوال واضح ہے لیکن نوجوان دانشوروں کی تذکیر کے لیے ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں:

❋ سقوط خلافت سے پہلے جمہور امت اور جمہور علماء کی سیاسی حکمت عملی یہ تھی:

’’بری بھلی خلافت کو قبول کیا جائے اور اسے بدلنے کے لیے مسلح جدوجہد نہ کی جائے بلکہ سسٹم کے اندر رہتے ہوئے پرامن طریقے سے سیاسی نظام کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔

علماء کرام اپنی سرگرمیوں کو معاشرے کی سطح پر تعلیم، تزکیۂ نفس اور فقہ و اجتہاد پر مرتکز رکھیں اور ریاستی سطح پر عدالتی نظام تک محدود رہیں۔‘‘

❁ جدید دینی تحریکوں نے اس حکمت عملی پر نظر ثانی کرتے ہوئے جو نئی حکمت عملی وضع کی اس کا خلاصہ یہ ہے:

’’غلبۂ دین کے لیے ایک مضبوط اسلامی ریاست قائم کی جائے۔ اس کے لیے مسلم حکمرانوں سے پرامن حریفانہ کشمکش میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور عالم اسلام کے حکمران چونکہ جمہوریت، نیشنلزم، قومی ریاست اور آئین سازی پر مبنی مغرب کے سیاسی نظام کو قبول کیے ہوئے ہیں لہٰذا اسلامی مقاصد کے لیے مجبوراً اس سیاسی نظام میں حصہ لیا جائے اور اس کے ذریعے غلبۂ دین کی کوشش کی جائے۔‘‘

❁ جدید دینی تحریکوں کی طرف سے اس کم و بیش سو سالہ جدوجہد کے جو نتائج نکلے وہ یہ ہیں:

’’عالم اسلام میں کہیں بھی صحیح اور مضبوط اسلامی ریاست قائم نہیں ہو سکی۔ جہاں دینی عناصر جمہوری انتخابات جیت بھی گئے وہاں انہیں کام نہیں کرنے دیا گیا اور کچل دیا گیا۔ اس جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں غلبۂ اسلام کی بجائے مغربی تہذیب کے سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم.... غالب آ گئے۔ عوام دین سے دور ہو گئے اور دینی عناصر کی سیاسی اہداف میں ناکامی سے ناامیدی نے جنم لیا اور مسلم معاشرے میں قوت سے غلبۂ دین کے لیے کام کرنے والی تحریکیں (القاعدہ، داعش، الھجرۃ والتکفیر وغیرہ) ابھر کر سامنے آئیں۔ فرد کی تعمیر و اصلاح خصوصاً تعلیم و تربیت، تزکیۂ نفس، اجتہاد اور معاشرے کی اصلاح پر توجہ مرکوز نہ کی جا سکے۔‘‘

ان نتائج سے ظاہر ہے کہ جدید دینی تحریکیں کئی مثبت اور تعمیری اثرات پیدا کرنے کے باوجود، بحیثیت مجموعی اپنے اہداف میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے پچھلے تجربات کے پیش نظر سابقہ سیاسی حکمت عملی پر نظر ثانی کی تھی، اب ان کے تجربات کے بعد ان کی سو سال قبل اختیار کی گئی حکمت عملی پر نظر ثانی کیوں نہیں کی جا سکتی اور کیوں نہیں کی جانی چاہیے؟

فہم دین

پروفیسر زاہد صدیق مغل [۱]

تجدد کا پائے چوبیں

[اس مضمون کے بعد دیکھیے اس پر البرہان کا تبصرہ]

کل بروز جمعرات ''علم الکلام کے جدید مباحث'' کے موضوع پر اسلامی نظریاتی کونسل میں مدرسہ ڈسکورسز کے زیر اہتمام ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس میں متعدد اہل علم احباب نے اپنی آراء کا اظہار کیا۔ برادر عمار خان ناصر کی دعوت پر راقم نے بھی اس میں شرکت کی۔ مختلف احباب نے موضوع سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ ان کی گفتگو سے اخذ ہونے والے چند اہم تاثرات یہاں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں:

کئی حضرات (مثلا جناب ثاقب اکبر، خورشید ندیم اور ماھان مرزا صاحب) نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ماضی کا فہم اسلام نئے دور میں متروک سمجھا جانا چاہئے۔ ثاقب اکبر صاحب نے اس مقدمے کو چند جزوی فقہی مسائل کی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی (مثلا خاتون کی گواہی) اور اس بات پر زور دیا کہ نیا اجتہاد کرنا چاہئے۔ اس پر بس اتنا ہی عرض ہے کہ ضرور کیجیے جناب، کس نے روکا ہوا ہے؟ ثاقب اکبر صاحب نے ایسا اجتہاد نہ کرنے والوں کو ''عقل دشمنی'' سے بچنے کا مشورہ بھی دیا۔

خورشید ندیم صاحب نے اسی بات کے لئے ایک اصولی مقدمہ وضع کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا اصل مطالبہ ایک متقی بندہ مومن سے یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان لائے۔ یہ جسے علم کلام کہتے ہیں یہ مذہب کا داخلی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خارج سے پیدا ہونے والے مطالبات و چیلنجز کی بنیاد پر مذہبی اذہان کو مطمئن رکھنے کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اگر خارج کے حالات و مطالبات بدل جائیں تو لازم ہے کہ ماضی کی پوری مذہبی علمی روایت (بشمول علم تفسیر) کو بھی ترک کر دیا جائے اور اس کا بوجھ مذہب کے کاندھوں پر لادنا نہیں چاہیے۔ اس پر مختصر تبصرہ بس یہ ہے کہ خورشید صاحب کا فہم کلام ناقص ہے کیونکہ کلامی ایکٹیویٹی کسی بھی فکر کا خارجی نہیں بلکہ

[۱] نسٹ یونیورسٹی، اسلام آباد

داخلی مسئلہ ہوتا ہے۔ان کی گفتگو کا حاصل یہ بنتا ہے کہ دین کسی چیز کا نام ہے ہی نہیں، یہ صرف خارج کا مرہونِ منت ہے۔

ماہان مرزا صاحب نے اسی مقدمے کو سائنسی نظریات کی روشنی میں ''بصورت سوال'' آگے بڑھایا کہ انسان کی ابتداء وحقیقت کے بارے میں ایک کہانی وہ ہے جو مذاہب بتاتے چلے آئے ہیں اور ایک کہانی جدید سائنسی علم بتا رہا ہے جسے ''بگ ہسٹری'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ چنانچہ لازم ہے کہ اہل مذھب اس گرینڈ ہسٹری کے تناظر میں اپنی کہانی کا یا تو ازسرنو جائزہ لیں اور یا پھر ان سوالات کا شافی جواب دیں۔ ماہان صاحب نے بگ ہسٹری کے تناظر میں اہل مذہب کے سامنے تو بڑے بامعنی سوالات رکھے لیکن ان کی توجہ کبھی اس طرف نہیں جاتی کہ خود اس بگ ہسٹری کے تناظر میں جدید انسان کے غیر مذہبی اخلاقی تصورات کی حیثیت کیا رہتی ہے؟ کیا بگ ہسٹری سے جنم لینے والے سوالات اہل مذہب کے لئے زیادہ معنی خیز ہیں یا خود اس نظریئے پر ایمان رکھنے والے حضرات کے لئے؟

دوسری تقسیم جس کا اظہار متعدد شرکاء (بشمول اکرم ورک اور خالد مسعود صاحب) نے کیا وہ یہ تھی کہ فقہ و دین میں فرق کرنے کی ضروت ہے (بعض لوگ اسے شریعت و دین کا فرق بھی کہتے ہیں)۔فقہاء نے فقہ کے نام پر جو مسائل اخذ کیے وہ دین کو سمجھنے کی صرف ایک انسانی کاوش تھی نہ کہ بذات خود دین۔ دین صرف اس شے کا نام ہے جو خدا نے نازل کیا ہے۔ یہ دوسری بات دراصل پہلی ہی بات کا ایک منطقی تسلسل ہے بلکہ پہلی بات کا منطقی جواز ہے، یعنی نئ آراء قابلِ قبول بنانے کے لئے لازم ہے کہ پہلے والی آراء چھڑوائی جائیں اور چونکہ لوگ انہیں دین سمجھتے ہیں لہذا یہ کہا جائے کہ وہ دین نہیں ہیں اور اس کے لئے دین وفقہ کی دوئی کا مقدمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ جو حضرات دین وفقہ کی دوئی کے اس فلسفے کے قائل ہیں ان سے بس دو سوالات ہیں: ایک یہ بتایا جائے کہ ماوراء ہر قسم کی فقہ دین کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ ہمیں جو بتائیں گے کیا وہ انسانی کاوش وفقہ نہیں ہوگی؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اور اگر ہوگی تو پھر دین کیا اور کہاں ہے؟ پیچیدہ بحثوں میں پڑے بغیر اگر ان سادہ سوالات پر ہی غور کرلیا جائے تو اس فلسفے کی منطقی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔

فہم دین مدیر

علماء کرام کے تساہل اور علمی کمزوری کی وجہ

پاکستان میں تجدد کی پھیلتی ہوئی تحریک

قارئین کرام! پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب کی مختصر رپورٹ آپ نے پڑھی۔ ہم اس سے پہلے بھی مدرسہ ڈسکورسز کی رودادوں پر تبصرہ البرہان میں پیش کرتے رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی آقاؤں کی مدد سے سرسید تجدد بذریعہ تعلیم اور غلام احمد قادیانی خانہ ساز نبوت کے اجراء میں کامیاب ہوئے اور یہ دونوں تحریکیں آج بھی کڑوا پھل لا رہی ہیں۔ اسی طرح ہمارے عہد میں جاوید غامدی صاحب بھی پاکستان میں تجدد کی تحریک کو کامیابی سے لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کا تجزیاتی مطالعہ ایک مفید اور دلچسپ موضوع ہوسکتا ہے۔ ہماری رائے میں اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ جاوید صاحب نہایت ذہین اور زیرک آدمی ہیں۔ انہوں نے بجا طور پر اور بروقت بھانپ لیا کہ مغرب کو اس وقت مسلم معاشرے میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ایک ایسی موثر اور اہل شخصیت کی ضرورت ہے جو کارِ تجدد اور مغرب کے نظری مفادات کو آگے بڑھا سکے.... اور اگر انہوں نے ایسا سوچا کہ وہ اس کے اہل ہیں تو یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کہ ان کا دین کا گہرا مطالعہ ہے، عربی اور انگریزی پر دسترس رکھتے ہیں۔ اردو بہت اچھی لکھتے ہیں۔ اظہار بیان کا سلیقہ بھی ہے اور سنجیدہ مدلل اور پر اثر تقریر و تحریر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ جہاں تک شہرت اور دولت کی حرص کا تعلق ہے تو وہ نفس امارہ کی خواہش ہوتی ہی ہے۔

۲۔ مغرب کی حمایت کے ساتھ ایسے پاکستانی حکمرانوں کی حمایت بھی انہیں میسر آ گئی جو اپنے ذاتی اقتدار کے لیے مغرب کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے تیار تھے جیسے جنرل مشرف۔

۳۔ وہ ایسے پڑھے لکھے اور باصلاحیت تلامذہ کی ایک ٹیم تیار کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے جنہوں نے ان کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خورشید ندیم صاحب جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں کام کر رہے ہیں اور عمار ناصر صاحب علماء اور دینی مدارس میں ان کی

فکر کو پھیلا رہے ہیں۔ عمار صاحب خصوصاً تحریک تجدد کے لیے بہت عمدہ کام اس لیے کامیابی سے کر رہے ہیں کہ وہ مذہبی چہرہ رکھتے ہیں، ایک دینی مدارسہ کے فارغ ہیں۔ ان کے والد مولانا زاہد الراشدی صاحب معروف دیوبندی عالم دین ہیں جن کی پشت پناہی انہیں حاصل ہے چنانچہ ماہنامہ الشریعہ اور الشریعہ اکیڈمی کو وہ بہت عمدہ طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ امام اہل سنت مولانا سرفراز صفدر مرحوم کا نام اور خاندان ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ چونکہ وہ انگریزی پر بھی دسترس رکھتے ہیں اس لیے ایک مغربی مسیحی مشنری یونیورسٹی اور وہاں کے مستشرقین اور متجددین سے مل کر انہیں پاکستانی مدارس کے طلبہ کی برین واشنگ کا اچھا موقع مل گیا ہے۔ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے انہوں نے الشریعہ اکیڈمی میں دورۂ تفسیر اور عربی انگریزی کورسز کے بعد اب تخصص فی الاصول کی ابتداء بھی کر دی ہے۔ اس طرح وہ یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اگلے چند سالوں میں وہ دینی مدارس کے بہت سے فضلاء کو اپنا ہم خیال بلکہ تحریک تجدد کا متحرک کارکن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

۴۔ جاوید صاحب اور ان کی ٹیم اپنے ہم خیال افراد کو، وہ جہاں کہیں بھی ہوں، متحرک و منظم کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتی خواہ وہ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا اقبال انسٹی ٹیوٹ ہو، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز ہو، اسلامی نظریاتی کونسل ہو، جامعہ امدادیہ فیصل آباد جیسا کوئی دینی مدرسہ ہو یا دنیا ٹی وی ہو، یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب یا گفٹ یونیورسٹی ہو یا اخبارات کے کالم ہوں۔

۵۔ پاکستان میں تحریک تجدد کے بڑھتے ہوئے اثرات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علماء کرام کی اکثریت کو نہ ان حالات سے واقفیت ہے اور نہ اس کی پروا۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے مسلک کے مطابق درس نظامی کی کتابیں پڑھا کر اور طلبہ کی محدود تعداد کو اپنی خاص وضع کا دینی ماحول دے کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ابلاغ دین کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ پچھلے ستر سال میں کالجوں یونیوسٹیوں کی مغرب زدہ تعلیم نے جن کروڑوں لوگوں کی ذہن سازی کی ہے ان کے نزدیک ان کے درس نظامی اور ان کے پیدا کردہ دینی ماحول کی کوئی وقعت و اہمیت ہی نہیں بلکہ وہ ان کی باغی ہے اور غامدی صاحب جیسے سکالرز وں کی اسلام کے بارے میں شائستہ اور مدلل گفتگو کے سحر میں مبتلا ہو رہی ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۴)

فہم دین		صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی[۱]

جاوید غامدی مولانا اصلاحی کے شاگرد نہیں ہیں

ایک ضروری وضاحت

ماہنامہ المنبر فیصل آباد کے مئی، جون ۲۰۱۹ء کے شمارہ میں جناب محمد سلیم جباری صاحب کا مضمون ''جناب جاوید احمد غامدی کے افکار و نظریات'' شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ '' دراصل غامدی صاحب شاگرد ہیں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے اور اصلاحی صاحب مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد ہیں۔ بنیادی طور پر اُنہیں فراہی سکول آف تھاٹ (یعنی فراہی مکتبہ فکر) کا نام دیا جاتا ہے۔ فراہی صاحب کے اپنے اُصول تفسیر ہیں اور اُس پر اُن کی ''فراہی اُصول تفسیر'' پر مشتمل کتاب بھی موجود ہے۔''

اس سلسلے میں یہ وضاحت کرنا دلچسپی کے علاوہ ریکارڈ کی درستی کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ قصداً پھیلائی گئی غلط فہمی کے باعث مولانا اصلاحی بعض حلقوں میں مطعون ہو رہے ہیں اور اُن کی تفسیر بن پڑھے بدنام ہو رہی ہے۔ پہلی بات یہ کہ جاوید احمد غامدی صاحب مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد نہیں ہیں کیونکہ کسی اہل علم کا لیکچر سننا یا اُس کے درس میں شامل ہونا شاگرد ہونے کے مترادف نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے درسوں میں ہر نوع کے لوگ شرفِ سماعت حاصل کرتے ہیں، کچھ برکت کے لیے اور کچھ سننے کے لیے مگر وہ شاگرد نہیں ہوتے صرف سامع اور مجلس کے شریک ہوتے ہیں۔ مولانا اصلاحی کے تلمیذ رشید مرحوم خالد مسعود صاحب نے مولانا کی ہدایت پر اور اُن کی نگرانی میں 'ادارہ تدبر قرآن و حدیث' قائم کیا تھا تا کہ شوق رکھنے والے قرآن فہمی کے اُصول سیکھیں اور اُن سے بنیادی دینی علوم حاصل کریں۔ غامدی صاحب ادارے کی سرگرمیوں میں کبھی کبھار شامل ہوتے رہے ہیں۔ اس ادارے کے تحت مولانا اصلاحی کے دروس اور لیکچر ہوتے تھے۔ مرحوم خالد مسعود صاحب نے شرکاء کو ایک نظم کا پابند بنانا چاہا مگر غامدی صاحب نے تعاون نہیں کیا اور تاکیدی اور وضاحتی مراسلت کا جواب تک دینا پسند نہ کیا۔ یہی رویہ غامدی صاحب کے حلقے کے چند اور لوگوں کا بھی

---

[۱] دانشور، مصنف، چیف ایگزیکٹو منصورہ ٹیچنگ ہسپتال لاہور

رہا کیونکہ وہ اصحاب اپنے کسی خاص مقصد کے لیے مولانا کے پاس آتے تھے، حصول علم اُن کا مقصد وحید نہیں تھا۔ اُنہیں کسی طرح مولانا کے نام کی چھتری مطلوب تھی۔ چنانچہ عدم دلچسپی اور عدم تعاون کی بناء پر غامدی صاحب کو ''ادارہ تدبر قرآن وحدیث'' کی رکنیت سے فارغ کر دیا گیا۔

شاگردی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی طالب علم با قاعدگی کے ساتھ ایک کلاس میں شریک ہو۔ اُستاد کا متعین نصاب اور منتخب اسباق پڑھے اور شاگردی کے تمام لوازمات حتی الامکان ادا کرے۔ جاوید احمد غامدی صاحب مولانا کی نشستوں میں گاہے بگاہے شریک ضرور ہوئے ہیں لیکن وہ مولانا کے شاگرد نہیں ہیں بلکہ غامدی صاحب مولانا کے اُستاد نکلے!۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ مولانا اصلاحی کو سمجھ سکے ہیں اور نہ تدبر قرآن کو جان سکے ہیں۔ اُن کا اپنا ایجنڈا تھا اور ہے۔ غامدی صاحب کو مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کا فکر چُھو کر نہیں گیا۔ بنیادی طور پر وہ نرگسیت زدہ، میڈیا پسند اور نمایاں ہونے کے خواہش مند واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنی طلاقت لسانی، تھوڑے علم اور مولانا وحیدالدین خان کے نظریات کے ساتھ مغربی تہذیب، نیو ورلڈ آرڈر اور امریکی مارکہ اسلام کے داعی ہیں۔ غامدی صاحب اور مولانا وحید الدین خان صاحب کی تحریروں کو دیکھیں تو غامدی صاحب کی شاگردی اور اُن کے فکری سوتے نظر آجاتے ہیں۔

مولانا اصلاحی کے پاس جانے یا اُن کے ساتھ وابستہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ غامدی صاحب ایک بے اُستادے اور خودخواندہ دانشور ہیں۔ اُنہیں مولانا اصلاحی کی شکل میں ایک قد آور نام چاہیے تھا جہاں کچھ تفرد ہو، کچھ ندرت ہو، باقی کی رنگ آمیزی وہ خود کر لیں۔ اپنے قد کاٹھ کو بڑھانے کے لیے اور اپنے مخصوص مغرب نواز اور تجددی عزائم کو تقدس دینے کے لیے وہ مولانا کی آڑ لیتے ہیں اور اُن کے الفاظ کے پیچھے اپنے تیر چلاتے ہیں۔ عملاً غامدی صاحب آسان فقہ اور گوگل اسلام کے موید اور محرک ہیں۔ وہ جدید طبقے جو مذہبی مطالعے میں بہت ناقص اور سطحی ہیں اور فاسٹ فوڈ جیسے جدید مذہب اور جدید آرٹ وموسیقی کے دلدادہ ہیں، اُن کے لیے غامدی صاحب کے آسان اسلام اور آسان فقہ میں بڑی کشش موجود ہے۔

مولانا اصلاحی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ قرآن فہمی اور تفسیر نویسی میں بسر کیا۔ مولانا کے خیالات پہلے اُن کے رسالے ماہنامہ ''میثاق'' لاہور میں اور پھر کتابی شکل میں بصورت تفسیر تدبر قرآن کی نو جلدوں میں شائع ہوئے۔ آیت رجم پر البتہ ضرور عام بحث ہوئی مگر وہ بھی اس وقت جب وفاقی

شرعی عدالت نے ایک کیس میں اپنے فیصلے کی بنیاد تدبر قرآن پر رکھی ورنہ عمومی طور پر اہل حدیث، دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر نے فکرِ فراہی اور فکرِ اصلاحی کے خلاف کوئی محاذ آرائی نہیں کی بلکہ اکثر و بیشتر برصغیر کے علمی اور دینی حلقوں سے اُس کی تائید و توثیق سامنے آئی۔

ستم ظریفی یہ کہ جس شخص نے مولانا اصلاحی سے نہ صرف عربی زبان پڑھی، درسِ قرآن لیا، اُصولِ تفسیر سیکھے، مولانا کا منتخب نصاب پڑھا اور تفسیر تدبر قرآن کی کئی جلدیں شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا، اُنہوں نے مولانا اصلاحی کا جاری کردہ ماہانہ ''میثاق'' بڑی چاہت سے اپنایا اور مولانا کو بطور سرپرست لکھتے رہے، جن کے فکر پر مولانا اصلاحی کی گہری چھاپ رہی ہے۔ حیرت ہے وہ مولانا کی شاگردی سے بالکل انکاری ہو چکے۔ میرا اشارہ تنظیم اسلامی کے موسس صدر ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی طرف ہے۔ گویا ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی زندگی ہی میں مولانا اصلاحی کی شاگردی کے اعزاز سے کلی طور پر منحرف ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کرے اور اُن کی غلطیوں کو معاف فرمائے۔

میثاق کے پُرانے شماروں میں اور مطبوعہ تصانیف میں مولانا اصلاحی صاحب کے واضح طور پر تحریر کردہ افکار اور غامدی صاحب کے عصری بیانیوں اور ''میزانوں'' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کہاں اصل اور جینوئن تحقیق اور نصوص کی پابندی اور کہاں نقل اور من مانی توضیح و تشریح یعنی کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی! غامدی صاحب کا طرزِ استدلال فراہی اور اصلاحی فکر سے بالکل مختلف بلکہ اکثر متعارض ہے۔ البتہ غامدی صاحب اپنے وحیدی فکر اور مغرب زدگی کے لیے شیعہ مناظروں کی طرح سیاق و سباق سے جوڑ موڑ کر اپنا من پسند مفہوم نکال لیتے ہیں۔ غامدی صاحب کے لبرلزم، ہیومنزم، سیکولرزم سے منسلک مشہور زمانہ ''تفردات'' مثلاً گانا بجانا، رقص و موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، پردہ، دوپٹہ، عورتوں کے سر کے بال اور اُن کا چُست لباس، مخلوط مجالس، جدید تفریحات، سنت کی تعداد، تراویح، نفلی عبادات، فقہاء اسلام پر طعن و تشنیع وغیرہ وغیرہ فکر اصلاحی اور عمل اصلاحی سے اُن کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ بعض

فقہی جزئیات میں متقدمین میں بھی اختلاف ہے جسے غامدی صاحب آج اپنی تحقیق وتجدید کے طور پر میڈیا میں پیش کرتے رہتے ہیں۔مولانا اصلاحی کے نام کے ساتھ امام کی پخ بھی غامدی صاحب کی ایجاد بندہ ہے شاید اس لیے تاکہ کل وہ خود بھی امام ابو یوسف کہلا سکیں۔آج تک غامدی صاحب، اُن کے حواریوں اور اُن کے جرائد میں کبھی مولانا اصلاحی یا مولانا فراہی پر کوئی ریسرچ نہیں ہوئی البتہ غامدی پارلر میں فکر اصلاحی کو ہر بار ایک نیا بہروپ دینے کا سلسلہ جاری ہے۔اُن کے رسالوں میں مولانا اصلاحی کے دفاع میں کبھی قلم رواں نہیں ہوا۔مولانا فراہی کو تو وہ چیزے دیگر سمجھتے ہیں۔شاید اُنہیں سمجھنے کے لیے معیاری عربی زبان جاننا ضروری ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے تفسیر تدبر قرآن اپنے ''مشہور شاگرد'' کے طفیل نشانۂ ملامت بن کر اور علمی حلقوں میں مولانا اصلاحی بدنام ہو کر رہ گئے ہیں۔یہ خوب ناخلف شاگرد ہے جو ''اُستاذ'' کو نشانہ بنارہا ہے اور اس بہانے گونام نہیں بدنام سہی، کا فائدہ اُٹھارہا ہے۔فاعتبروا یا اولی الالباب.

بقیہ: پاکستان میں تجدد کی پھیلتی ہوئی تحریک

خود ان علماء کرام نے نہ جدید علوم پڑھے ہیں، نہ عصری مسائل پر ان کی زیادہ گرفت ہے لہٰذا وہ جدید عصری ذہن کو مطمئن کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے لیکن انہیں اپنی اس کمزوری کا بھی احساس نہیں اور نہ اسے دور کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی اضطراب ہے اور نہ ان کے ہاں اس طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے مستقبل میں کوئی پلاننگ ہے۔

۶۔ جدید دینی تحریکوں (جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی وغیرہ) کے لوگ، خصوصاً نوجوان، بھی غامدی صاحب کی تحریک سے متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ ان کے اپنے ہاں علمی ترفع کا قحط ہے۔جماعت میں مولانا مودودیؒ کے بعد کوئی بڑا عالم دین اور مفکر سامنے نہیں آیا اور نہ جماعت نے اس کے لیے کوئی شعوری منصوبہ بندی کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جن اہل علم کی دینی، اخلاقی اور علمی ذمہ داری تھی کہ وہ اس تحریک تجدد کا راستہ روکتے، وہ غافل بیٹھے ہیں۔تجدد کا راستہ روکنے کی کوئی کوشش وہ کر ہی نہیں رہے لہٰذا انہیں اس کی بھی فکر نہیں کہ وہ اسے روکنے کی موثر اہلیت رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ یعنی اصل المیہ یہ نہیں کہ وہ نہیں جانتے بلکہ اصل المیہ یہ ہے کہ انہیں اس چیز کا ادراک نہیں کہ وہ نہیں جانتے۔ یا اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما۔

اسلام اور پاکستان　　محمد عاصم حفیظ[۱]

پاکستان کو نظریاتی بنیادوں سے محروم کرنے کے لیے

تاریخ کو مسخ کرنے کا حربہ

بی بی سی لندن نے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے جس میں اس مطالبے پر زور دیا گیا ہے کہ لاہور میں رنجیت سنگھ کے مجسمے کے بعد اب سندھ میں راجہ داہر کا مجسمہ نصب کرنا چاہیے بلکہ پوری تاریخ کو ہی بدلنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ راجہ داہر کو ایک منصب دار، سندھ کا بیٹا اور کامیاب حکمران کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اپنی مرضی کے تاریخ دانوں کے حوالوں کے ذریعے ایسے تمام واقعات کو ہی جھوٹا قرار دیا گیا ہے جن میں راجہ داہر کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہو۔ اس دور میں لکھی گئی کتابوں میں، جن میں راجہ داہر کی جانب سے عرب جانے والے ایک قافلے کی لڑکیوں کو یرغمال بنانے، اپنی بہن سے شادی رچانے اور عوام پر ظلم وستم کے واقعات درج ہیں، ان سب کو مسترد کر کے موجودہ دور کے ایسے من پسند تاریخ دانوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جن میں جی ایم سید وغیرہ شامل ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ عالمی میڈیا اور کچھ این جی اوز اب یہ مطالبہ شروع کرانے کی کوشش میں ہیں کہ سندھ میں اسلام کے فروغ کا باعث بننے والے محمد بن قاسم کو ولن اور راجہ داہر کو ہیرو بنا کر پیش کیا جائے۔ اس حوالے سے تقریبات کا آغاز کر دیا گیا ہے جس کی تصویر بھی اس میڈیا رپورٹ میں لگائی گئی ہے۔ کمال یہ ہے کہ راجہ داہر کے تاثر کو مثبت ثابت کرنے اور اسے منصف و رحمدل ثابت کرنے کے لیے تاریخی حوالوں کا تو انکار کیا گیا ہے لیکن محمد بن قاسم اور اس وقت کے مسلمان حکمرانوں کو عیاش اور لالچی دکھایا جا رہا ہے۔ سندھ پر حملوں کو بھی لالچ اور باہمی چپقلش قرار دیا گیا ہے۔ ایک پیرا پڑھ کر آپ تعصب اور بغض وعناد کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ''پنجاب دہائیوں تک اپنی حقیقی تاریخ کو جھٹلاتا رہا ہے اور ایک ایسی مصنوعی تاریخ گھڑنے کی کوشش میں جتا رہا جس میں وہ راجہ پورس اور رنجیت سنگھ سمیت حقیقی قومی ہیروز اور سیکڑوں کرداروں کی جگہ غوری، غزنوی، سوری اور ابدالی جیسے نئے ہیروز بناتا اور پیش کرتا رہا جو پنجاب سمیت پورے برصغیر کا سینہ چاک کر کے یہاں کے وسائل لوٹتے رہے۔''

---

[۱] دانشور، صحافی، لیکچرر

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں کے بارے میں کس قسم کی سوچ پیدا کی جارہی ہے۔ یہ سب لبرل اور سیکولر لکھاری مسلمان حکمرانوں پر تنقید تو کرتے ہیں لیکن راجہ داہر کی جانب سے اپنے ہی خاندان پر ظلم وستم، رعایا کے قتل وغارت اور قافلوں کی لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی کو یکسر جھٹلا دیتے ہیں۔ان سب تاریخی کتابوں سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان ''نئے تاریخ دانوں'' سے چند سوالات کیے جائیں:

سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ نو سو سال پہلے کے راجہ داہر، رنجیت سنگھ ہیرو بنائے جا رہے ہیں تو صدیوں ان دھرتیوں پر حکمرانی کرنے والے مسلمان کیونکر ہیرو نہیں ہو سکتے؟ کیا آٹھ نو سو سال سے یہاں مقیم مسلمان اتنے عرصے کے بعد بھی ''مقامی'' نہیں بن سکے؟ یا کبھی نہیں بن سکیں گے؟ ان نئے تاریخ دانوں کا مطالبہ ہے کہ ہزار سال پرانے غیر مسلم حکمرانوں کو ہیرو تسلیم کیا جائے جن کے بارے میں مصدقہ تاریخ تک موجود نہیں۔وہ ان راجوں کے ظلم وستم کی داستانوں کو مسترد کر کے، بغیر حوالوں کے، نئی تاریخ بنانے پر تلے ہوئے ہیں لیکن ان کے بعد آنے والے مسلم حکمران ہیروز کے پیمانے میں فٹ نہیں ہو سکتے؟ کتنی عجیب منطق ہے کہ راجہ داہر کو تو ہیرو مانا جائے لیکن اس کے بعد کے سیکڑوں سالوں کی تاریخ کو مسترد کر دیا جائے؟ اس نفسیاتی مرض کے بارے میں آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟

اگر پرتھوی راج، راجہ پورس، رنجیت سنگھ اور راجہ داہر اتنے ہی منصف مزاج اور عوام دوست حکمران تھے تو عامۃ الناس کیونکر تیزی سے مسلمان بھی ہوئے اور آئندہ صدیوں تک مسلمانوں کو نہ صرف حکمران تسلیم کیا، ان کے ساتھی بنے، ان کے ساتھ رشتہ داریاں کیں اور ان کی آنے والی نسلیں مسلمان رہیں بلکہ اس اجنبی دیس میں آج بھی کروڑوں لوگ مسلمان ہیں بلکہ ظاہر ہے یہ سب عرب سے تو نہیں آئے۔ایک بار مسلمان ہونے کے بعد ان لوگوں نے کئی ادوار میں ہندو وسکھ ریاستوں کے وجود، انگریزوں کے ظلم وستم، مراعات کے لالچ اور بہت سے مواقع پر جب مسلمانوں کی گرفت انتہائی کمزور بھی ہوئی، لیکن ان لوگوں نے اپنا دین نہیں بدلا۔کبھی بھی تاریخ میں راجہ داہر اور رنجیت سنگھ کو ہیرو بنانے کی تحریک نہیں چلی۔لبرل وسیکولر لکھاریوں کی دلیل کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ تاریخ میں عوام نے کبھی بھی مسلمان حکمرانوں کو غیر اور بیگانہ نہیں سمجھا بلکہ ان سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے اور پھر صدیوں تک مسلمان ہی رہے۔اگر عرب، افغان، مغل اور ایرانی حملہ آور صرف لوٹ مار کرنے آتے تھے تو پھر یقینا

مقامی افراد میں ان کے خلاف شدید نفرت ہونی چاہیے تھی ،لوگوں نے کیونکر ان حملہ آوروں کا دین قبول کرلیا؟ ان کے واپس جانے اور حکمرانی کی گرفت کمزور پڑنے کے باوجود دین نہیں بدلا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ جبری مسلمان کیا گیا تو پھر کروڑوں لوگ ہندو، سکھ یا بدھ مت کے پیروکار کیسے رہ گئے؟ یہ کیسے بچ گئے؟ ہندوستانی فلموں تک میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مغلوں اور کئی دیگر ادوار میں متعدد ہندو، سکھ ریاستیں بھی موجود تھیں۔لوگوں نے ان ریاستوں میں پناہ کیوں نہ لی؟ بلکہ نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اس پر سختی سے عمل پیرا بھی رہے۔ انگریزوں کا دور مسلمانوں کے لیے مشکلات کا دور تھا۔اس میں بھی کبھی راجہ داہر اور رنجیت سنگھ کو ہیرو بنانے اور ان کے مجسمے لگانے کی مہم نہیں چلی۔اس وقت تو کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔اس سے بڑھ کر منافقت اور کیا ہوگی کہ ہیرو ماننے کے معیار میں سب سے پہلی شرط ہی" غیر مسلم" ہونا ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتی تو ایک ہزار سال پرانے راجہ داہر تک پہنچتے پہنچتے کوئی ایک دو مسلمان حکمران یا نامور شخصیات بھی مل ہی جاتیں لیکن ایسا نہیں ہوسکا؟ اور اگر واقعی سارے مسلمان حکمران ظالم، لٹیرے اور عیاش تھے تو پھر کس طرح اتنی بڑی آبادی ان کے دین پر رہی؟ وہ نہ صرف مسلمان رہے بلکہ ان میں بڑے بڑے علماء بھی پیدا ہوئے جن کی علوم قرآن وسنت میں مہارت کو عرب ممالک میں بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔

یہ چند سوالات ہیں جن کا لبرل وسیکولر لکھاریوں اور مورخوں کو جواب دینا چاہیے، بلکہ ان سے سوال یہ بھی کیا جانا چاہیے کہ اگر رنجیت سنگھ، راجہ داہر ہی ہیرو بنانے ہیں تو پھر برصغیر میں ایک الگ وطن بنانے کی ضرورت کیا تھی؟ اگر زمین، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر ہی ہیرو بنانے ہیں، دین کے تعلق کو تسلیم نہیں کرنا تو پھر پاکستان بنانے کی وجہ ہی ختم ہوجائے گی۔اہل دانش کو اس بارے میں غور کرنا چاہیے کہ اگر وہ بنیادیں ہی ختم کردی جائیں جن پر اس ارض پاک کی بنیاد ہے تو پھر قومی وحدت اور عوام میں اتفاق واتحاد کا تصور ہی کہاں رہ جائے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نوجوان نسل کو من گھڑت قصوں اور ایک ''نئی تاریخ'' کے ذریعے قومی اساس سے دور کیا جارہا ہے۔اگر یہی روش چل نکلی تو پھر ریاست بہاولپور کا ہیرو کوئی اور ہوگا، بلوچ اپنے سرداروں کو ڈھونڈیں گے، موہنجوداڑو والے ہزاروں سال پیچھے چلے جائیں گے۔ دراصل یہ دین کے نام پر جڑی قومی وحدت میں دراڑ ڈالنے کی کوششیں ہیں۔حکومت اور قومی اداروں کو ان اقدامات کا نوٹس لینا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ دیر ہوجائے اور خدانخواستہ ارض پاک کو کسی نئی آزمائش سے گزرنا پڑے۔

پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان میں اسلام

بے شمار مثبت پہلو لیکن نتیجہ صفر

بظاہر پاکستان میں اسلام کا مستقبل روشن لگتا ہے اس لیے کہ:

۱۔ صرف اس سال ۱۶ لاکھ لوگوں نے عمرہ کی سعادت حاصل کی۔

۲۔ اس سال دو لاکھ خواتین و حضرات حج کی سعادت حاصل کریں گے۔

۳۔ کوئی شہر، محلہ، گاؤں، قریہ، ڈھوک اور ڈیرہ ایسا نہیں جہاں مسجد نہ ہو۔

۴۔ ہر مسجد میں قرآن ناظرہ اور بعض مساجد میں حفظ قرآن کا انتظام موجود ہے۔

۵۔ ملک میں دینی مدارس کی تعداد ۳۵ ہزار سے زیادہ ہے۔

۶۔ صرف اس سال شہادۃ العالمیہ کی سند حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ۵ لاکھ سے زیادہ ہے اور حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد ۳ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

۷۔ نظامِ تعلیم میں قانوناً پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن کی تکمیل لازمی اور اب دسویں جماعت تک ترجمہ قرآن کی تکمیل لازمی ہے۔

۸۔ قانوناً کوئی شخص جس نے ناظرہ قرآن نہ پڑھا ہو استاد نہیں بن سکتا۔

۹۔ پرائیویٹ سکولوں کی کثیر تعداد بھی حفظ قرآن کی کلاسیں چلاتی ہے۔

۱۰۔ دینی مدارس میں تعلیم بالکل فری اور ساتھ رہائش اور کھانا بھی مہیا کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ پاکستان کے مخیر عوام ہر سال اربوں روپے دینی تعلیم کے لیے دیتے ہیں۔

۱۲۔ بڑے شہروں میں کئی مقامات پر غریب اور نادار افراد کو مفت کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔

۱۳۔ اخوت جیسا قابل فخر ادارہ ضرورت مند لوگوں کو کاروبار کے لیے اربوں روپے بلا

سود قرض دے رہا ہے اور قرض لینے والے لوگ نہایت دیانتداری سے ۹۹ فیصد سے زیادہ اپنا قرض واپس کر رہے ہیں۔

۱۴۔ اخوت ہی ایسے اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کر رہی ہے جہاں غریب بچوں کے لیے تعلیم بالکل فری ہے۔

۱۵۔ اخوت ایک ایسی اعلیٰ یونیورسٹی تعمیر کر رہی ہے جہاں تعلیم بالکل مفت ہوگی۔ اس طرح اسلامی تاریخ کی یہ روش وروایت کہ تعلیم کے مصارف طالب علموں سے نہیں لیے جاتے زندہ ہوگی۔

۱۶۔ ریاست پاکستان کا مذہب اسلام ہے اور دستورِ پاکستان اسلامی زندگی اور اسلامی قوانین وضوابط جاری کرنے کو یقینی بنانے کی بات کرتا ہے۔

۱۷۔ پاکستان کی مسلح افواج میں دینی تعلیم اور دینی فرائض ادا کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے نیز فوج کا ماٹو "ایمان، تقویٰ اور جہادِ فی سبیل اللہ" ایک ماحول اور جذبہ پیدا کرتا ہے۔

۱۸۔ پاکستان میں شراب اور قمار کی قانوناً ممانعت ہے۔

۱۹۔ پاکستان کے نظام تعلیم میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کے خلاف تعلیم نہیں دی جا سکتی۔

۲۰۔ پاکستان کے دستور میں جھوٹے نبیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے اور توہین رسالت کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔

ہم نے اختصار کے ساتھ بیس نکات کا ذکر کیا ہے لیکن شاید خیر کے کئی اور پہلو بھی گنوائے جا سکتے ہیں لیکن ان تمام مثبت پہلوؤں کے باوجود معاشرہ جن اخلاقی اور غیر اسلامی بیماریوں کا شکار ہے وہ بھی کوئی کم نہیں ہیں:

۱۔ جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی عام ہے۔

۲۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، ناجائز نفع خوری اور کاروباری بددیانتی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔

۳۔ فرقہ واریت اور اس پر مبنی شدت پسندی معاشرے کو تقسیم کیے ہوئے ہے۔

۴۔ ظلم، زیادتی، غریب ماری، قتل، چوریاں، ڈاکے اور دوسروں کا حق نہ دینے کی روش عام ہے۔

۵۔ رشوت، کام چوری، ملازمانہ بددیانتی، کرپشن، عدالتی ناانصافی بلکہ عدالتی ظلم ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔

۶۔ بے حیائی، فحاشی اور اس کے نتیجے میں چھوٹی عمر کی لڑکیوں، لڑکوں اور بے بس خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی اور بعض ازاں قتل کی وارداتیں روز افزوں ہیں۔

۷۔ رشتوں کے تقدس کی پامالی عام ہے۔ بچوں کے حقوق اور بڑوں کی خدمت وتکریم میں کمی آچکی ہے۔

۸۔ گھر ٹوٹ رہے ہیں۔ طلاقیں عام ہیں، خواتین بُری طرح استحصال کا شکار ہیں اور ٹوٹے گھروں کے بچے نفسیاتی مسائل میں مبتلا کیے جا رہے ہیں۔

۹۔ سیاسی جماعتوں نے گالی گلوچ کا کلچر عام کر کے نئی نسل کی تربیت کو داؤ پر لگا دیا ہے۔

۱۰۔ سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا حتیٰ کہ پرنٹ میڈیا بھی اخلاقی اور اسلامی ماحول اور روایات کے لیے زبردست خطرہ بن چکا ہے۔

یہ معاشرہ جسے اسلام کی روشن روایات کا مظہر ہونا چاہیے تھا اب ایک متعفن مردار کی طرح بدبودار معاشرہ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔

اوپر کے بیس نکات پر نگاہ دوڑا کر جب بعد کے دس نکات پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ اتنے مثبت پہلوؤں کے باوجود اتنا منفی نتیجہ کیوں برآمد ہو رہا ہے؟ یہ امر ہمارے علماء کرام، اساتذہ، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

ہماری نظر میں اس کا جواب صرف ایک نکتے میں ہے وہ یہ ہے کہ ہم اتنی زیادہ دینی سرگرمیوں کے باوجود اپنے معاشرے کو درست دینی تصور دینے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم یہاں علمائے کرام اور دانشورانِ عظام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مشکل سے نکلنے کے لیے علاج اور تدابیر تجویز فرمائیں۔

تفہیم مغرب

ڈاکٹر مجاہد کامران[۱]

امریکی میڈیا کی حقیقت[۲]

دنیا کے مختلف خطوں میں آباد لوگ یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر امریکی میڈیا امریکی عوام کے سامنے حقائق کی مسخ شدہ تصویر پیش کرتا ہے لیکن بہت سے لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ اسی طرح امریکی حکومت کی خارجہ پالیسی کے بہت سے پہلو غیر منصفانہ ہیں۔ اس کا ایک سبب امریکی میڈیا کی بے پناہ قوت ہے جس کے ذریعے امریکہ کے طبعاً انصاف پسند اور راست گو عوام کی اجتماعی سوچ کو مخصوص خطوط پر ڈھالا جاتا ہے۔ پھر امریکہ میں بننے والی کئی فلموں میں ایسے ڈائیلاگ یا فقرے ڈال دیئے جاتے ہیں جن سے بعض مذاہب یا نظریات یا قوموں کو منفی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ امریکی میڈیا کا کنٹرول کن ہاتھوں میں ہے؟ کیا امریکی میڈیا بہت سے مختلف مکاتب فکر کے مالکان کے ہاتھ میں ہے یا صرف چند افراد یا چند خاندان اسے کنٹرول کرتے ہیں؟ اور اگر چند لوگ ہی امریکی میڈیا کے مالک ہیں تو پھر کیا یہ لوگ کسی ایک مشترک نقطۂ نظر کے حامل ہیں یا ان میں مختلف فکری رنگ موجود ہیں؟ یاد رہے کہ آج کل میڈیا میں ٹی وی چینل، اخبارات، میگزین، فلم ساز کمپنیاں، موسیقی بنانے اور بیچنے والی کمپنیاں کتابوں کے پبلشرز وغیرہ سبھی شامل ہیں۔

اس وقت امریکہ کی سب سے بڑی میڈیا کمپنی کا نام 'ٹائم وارنر' ہے۔ دراصل بیسویں صدی کے آغاز میں دو یہودی بھائیوں نے مشہور فلم ساز کمپنی 'وارنر برادرز' بنائی جو ہالی وڈ کی سب سے طاقتور کمپنی بن کر اُبھری۔ اسی طرح 'ٹائم اِن کارپوریٹڈ' رسائل اور اخبارات شائع کرنے والی کمپنی تھی جو مشہور زمانہ ''ٹائم میگزین'' بھی شائع کرتی ہے۔ انٹرنیٹ کی ایجاد کے بعد 'AOL' امریکہ کی سب سے بڑی انٹرنیٹ کمپنی بن کر اُبھری جس کے قریباً ساڑھے تین

---

[۱] ریکٹر یونیورسٹی آف لاہور، سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب

[۲] ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''پس پردہ'' سے ماخوذ

کروڑ کسٹمرز ہیں۔ ان کمپنیوں کے مدغم ہونے سے 'AOL ٹائم وارنز' کمپنی بنی جس کا نام چند برس پہلے تبدیل کر کے 'ٹائم وارنز' کر دیا گیا کیونکہ حکام نے AOL کے مشکوک حسابات کے خلاف تحقیقات شروع کر دی تھیں۔ 2003ء میں ٹائم وارنر کی آمدن 39 ارب 60 کروڑ ڈالر تھی۔ اس کمپنی کے پاس AOL ٹائم پبلشنگ ادارہ، Cinemax,HBO,CNN، وارنر میوزک، نیو لائن سینما، کاسل راک انٹرٹینمنٹ، وِن ایمپ اور اس طرح کی کئی کمپنیاں ہیں۔ 'ٹائم وارنز' کا چیف ایگزیکٹو آفیسر اور ڈائریکٹر جیرالڈ لیون نامی ایک یہودی تھا۔ اسے CNN کے بانی عیسائی ٹیڈ ٹرنر کے ساتھ جھگڑے کے بعد 2002ء میں سبکدوش کر کے ایک سیاہ فام مہرے کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا لیکن کنٹرول بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پاس ہے۔ ٹیڈ ٹرنر کو لیون نے نمبر تین پوزیشن سے ہٹا دیا تھا جس کے نتیجے میں ٹرنر 85% دولت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ٹرنر کہتا ہے کہ AOL اور ٹائم وارنر کے ساتھ مدغم ہو کر اس نے بہت نقصان اٹھایا۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز مجموعی طور پر اہل یہود کے ہاتھ میں ہے۔

امریکہ کی دوسری بڑی میڈیا کمپنی 'والٹ ڈِزنی' ہے۔ یہ ایک زمانے میں والٹ ڈِزنی خاندان کی کمپنی تھی۔ اس کمپنی کا موجودہ مالک، اس کا چیف ایگزیکٹو آفیسر اور چیئرمین مائیکل آئزنز نامی یہودی ہے۔ 2003ء میں اس کمپنی کی آمدن 27.1 ارب ڈالر تھی۔ والٹ ڈِزنی ٹی وی، والٹ ڈِزنی موشن پکچرز، ہالی وڈ پکچرز، میرامیکس، ٹچ سٹون پکچرز وغیرہ سبھی اس کمپنی کا حصہ ہیں۔ یہ تمام نام دنیا بھر میں فلموں کے حوالے سے جانے پہچانے ہیں۔ علاوہ ازیں آئزنز ABC ٹیلیویژن نیٹ ورک کا مالک ہے جس کے پاس درجنوں ٹی وی سٹیشن ہیں۔ اسی طرح ABC 54 ریڈیو سٹیشنوں کی مالک ہے اور اس سے کہیں زیادہ سٹیشنوں پر اس کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ سپورٹس چینل ESPN بھی ABC ہی کی ذیلی کمپنی ہے۔ A&E، لائف ٹائم ٹی وی اور ہسٹری چینل بھی والٹ ڈِزنی کمپنی کا حصہ ہیں۔ ABC فیملی چینل کے 8 کروڑ چالیس لاکھ صارفین ہیں۔ صہیونیوں کا آلۂ کار پادری پیٹ رابرٹسن اسی ABC فیملی چینل پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتا تھا۔ والٹ ڈِزنی میں ایک درجن سے زائد انٹرنیٹ کمپنیاں بھی شامل ہیں۔

امریکہ کی تیسری بڑی کمپنی کا موجودہ نام Viacom ہے۔ یہ کمپنی 1971ء میں امریکی

عدالت کے اینٹی اجارہ داری فیصلے کی وجہ سے قائم کی گئی جس کی رو سے CBS کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے کیبل آپریشنز اور دیگر معاملات کو علیحدہ کرے۔ اس کمپنی کی ملکیت بھی ایک یہودی کے ہاتھ میں دی گئی۔ Viacom کے مالک کا موجودہ نام سمنر ریڈسٹون ہے۔ اس کا اصلی نام مرے راتھ سٹائن ہے اور اس کے پاس کمپنی کے 76% حصص ہیں۔ Viacom دنیا بھر کو سب سے زیادہ کیبل پروگرام مہیا کرتی ہے۔ Nickelodeon,MTV، شوٹائم، بلیک انٹرٹینمنٹ سبھی اسی کمپنی کے ہیں۔ Viacom 39 ٹی وی سٹیشنوں کی مالک ہے اور اپنے CBS ٹیلی ویژن نیٹ ورکس کے ذریعے اس کے ساتھ 200 مزید سٹیشن منسلک ہیں۔ Viacom 185 ریڈیو سٹیشنوں کی بھی مالک ہے اور CBS ویڈیو نیٹ ورک کے ساتھ 1500 مزید ریڈیو سٹیشن منسلک ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اپنی ہی کمپنی پیراماؤنٹ پکچرز کے ذریعے فلمیں بھی بناتی ہے۔

تین متذکرہ بالا کمپنیوں کے علاوہ چند اور بڑی میڈیا کمپنیاں بھی ہیں۔ چوتھے نمبر پر 'این بی سی یونیورسل' نامی کمپنی ایک یہودی ایڈگر بران فیم جونیئر کی ملکیت ہے۔ اس کا والد ورلڈ یہودی کانگرس کا صدر ہے۔ آج کل این بی سی یونیورسل کا چیئر مین ایک صہیونی نواز عیسائی باب رائٹ ہے۔ یونیورسل سٹوڈیو کا چیئر مین ران مائر نامی یہودی ہے جبکہ اس کمپنی کے یونیورسل ٹیلی ویژن گروپ کی چیئر مین شپ ایک اور یہودی کے پاس ہے جس کا نام جیف ڈُکر ہے۔ جہاں تک NBC یونیورسل کے میڈیا آپریشنز کا تعلق ہے یہ سراسر یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔

ایک اور بہت معروف میڈیا مالک روپرٹ مرڈاخ ہے جس نے حال ہی میں ''وال سٹریٹ جرنل'' بھی خرید لیا ہے۔ مرڈاخ کی کمپنی کا نام 'نیوز کارپوریشن' ہے جس نے 2003ء میں 19.2 ارب ڈالر کمائے۔ مرڈاخ فاکس ٹی وی، فاکس نیوز اور ایف ایکس چینل کا مالک ہونے کے علاوہ بہت سے اخبارات اور معروف پبلشنگ ادارے 'ہارپر اینڈ کالنز' کا بھی مالک ہے۔ مشہور فلم کمپنی 'ٹونٹیتھ سنچری فاکس' بھی اسی کی ہے۔ روپرٹ مرڈاخ کی ماں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی تھی۔ اس سے قطع نظر مرڈاخ عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بہت بڑا حامی اور پروموٹر ہے اور اس کے اخبارات اور ٹی وی چینل اسی پالیسی پر چلتے

ہیں۔مرڈاخ آسٹریلیا اور یورپ میں بھی اخبارات اور ٹی وی چینلوں کا مالک ہے۔آمدن کے اعتبار سے ’نیوز کارپوریشن‘ امریکہ میں پانچویں نمبر پر ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ کم وبیش ان تمام بڑی کارپوریشنوں کی ذیلی کمپنیاں غالب حد تک اہل یہود کے کنٹرول میں ہیں۔ایک مصنف،جس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا،Rense.com پر ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ اے بی سی، این بی سی اور سی بی ایس چینل پہلے ایک دوسرے سے علیحدہ تھے لیکن ہر ایک کا مالک روزِ اوّل سے یہودی تھا۔’’چند دہائیوں میں اوپر سے لے کر نیچے تک یہ نیٹ ورک یہودیوں سے بھر دیئے گئے ہیں اور جب یہ نیٹ ورک مدغم بھی ہوئے تو ان کا یہودی پن متاثر نہ ہوا کیونکہ ادغام کے بعد بھی کمپنیوں کے مالک یہودی تھے۔‘‘ یہی حالت اخبارات کی ہے۔ اس وقت امریکہ کے 80% اخبارات بڑی بڑی نیوز پیپر Chains کے پاس ہیں جن کی ملکیت اور نظم ونسق اکثر وبیشتر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔وہ اخبارات جو غیر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں وہ اشتہارات کے لیے امیر یہودیوں کے مرہون منت ہیں۔ان حالات میں امریکہ کی آزادئ تحریر وتقریر انتہائی طور پر مسخ شدہ حالت میں ہے۔متذکرہ بالا مضمون کے مصنف نے لکھا ہے: امریکی ماس میڈیا کا یہودی کنٹرول زندگی کی واحد اہم ترین حقیقت ہے۔ہمارے عوام کے مستقبل کے لیے اس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں۔نہ قحط، نہ وبا، نہ اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونا اور نہ ہی ایٹمی جنگ۔میڈیا پر یہودیوں کا کنٹرول ہماری خارجہ پالیسی کو متعین کرتا ہے اور امریکی مفادات کی بجائے یہودی مفادات کی بنیاد پر امن اور جنگ کا فیصلہ ہوتا ہے۔مثلاً بغیر یہودی میڈیا کنٹرول کے مشرق وسطیٰ کی جنگ نہ ہوتی۔امریکہ کے میٹھے اور نیک دل امریکی عوام کا استحصال کب تک جاری رہے گا؟ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ امریکی یہودیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس قسم کے کنٹرول کو پسند نہیں کرتی۔ 2003ء میں جان وٹ لی نے اس ویب سائٹ پر ایک مضمون بعنوان’’سیون جیوش امیریکنز کنٹرول موسٹ یو ایس میڈیا‘‘ پوسٹ کیا تھا۔امریکی جمہوریت کی آج کی بدلی ہوئی صورتِ حال کا یہ عالم ہے کہ امریکی میڈیا کنٹرول پر پوسٹ ہونے والے مضمون کے مصنف نے اپنا نام بھی ظاہر نہیں کیا حالانکہ اس کے پیش کردہ حقائق درست ہیں۔

تفہیم مغرب　　مولانا عبیداللہ خالد [۱]

مغربی تہذیب کا ناسور

اسلام نے انسان کو زندگی گزارنے کے مکمل طور طریقے عطا کیے ہیں۔ایک انسان کو اپنے خالق و مالک کی خوش نودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے عبادات، اخلاق، معاملات اور رہن سہن میں کن طریقوں کو اختیار کرنا چاہیے اور ان امور کی انجام دہی میں کس طرح عمل پیرا ہونا چاہیے؟ اسلام ان تمام امور میں کفار کی نقالی اور مشابہت اختیار کرنے کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے منع کرتا اور روکتا ہے۔ چنانچہ اذان، نماز، روزہ، لباس وغیرہ کتنے امور ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا ہے۔نماز کے اعلان کا معاملہ جب زیر غور آیا تو آپ نے ناقوس وغیرہ چیزوں کو اس لیے مسترد فرمایا کہ ان میں یہود ونصاری کی مشابہت ہے کہ وہ اپنی عبادات کے اعلان کے لیے ان کا استعمال کرتے ہیں۔ بالآخر نماز کے اعلان کے لیے اذان کی صورت تجویز ہوئی اور اہل اسلام کا شعار قرار پائی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکروہ اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا کہ اس میں مشرکین کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہودیوں کی مشابہت کی وجہ سے عاشورہ کے ایک روزے سے منع فرمایا اور دو روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ یہود ونصاری کی مشابہت ترک کرنے کے لیے سحری کرنے اور افطاری میں جلدی کرنے کا حکم فرمایا کیونکہ یہودی سحری نہیں کرتے تھے جب کہ یہود ونصاری دونوں افطار میں تاخیر کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے زرد رنگ کا لباس پہنا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کی مشابہت کی وجہ سے انہیں اس طرح کا لباس پہننے سے منع فرمایا۔

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ nbâ@ŤcnяL·~k ý‚ منهم t یعنی جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ ان میں سے شمار ہوگا۔ یہ حدیث عبادات، معاملات، اخلاق، عادات واطوار اور تہذیب وثقافت وغیرہ تمام امور میں مشابہت اختیار کرنے کو شامل ہے، لہٰذا ان تمام امور میں کفار کی مشابہت اختیار کرنا ممنوع ہے۔ مذکورہ بالا تمام روایات احادیث کی معتبر ومستند کتب میں موجود ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر:۵۸)

---

[۱] جامعہ فاروقیہ کراچی ومدیر ماہنامہ الفاروق

مدیر

'مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا' (۳)

تم گدھے ہو

[آج 'مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا' کے موضوع پر چند سطور لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس سلسلۂ مضامین کی ابتداء میں اس امر کا ذکر کرنا چاہیے تھا کہ ان سطور کے محرک مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہ العالی ہیں۔[۱] یہ بڑے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں کہیں کچھ خیر کے جراثیم نظر آئے، اس کی حوصلہ افزائی کردی۔ البرہان کی کسی تحریر سے بالواسطہ طور پر یہ ظاہر ہوا کہ مَیں معمر ہوگیا ہوں اور زندگی میں دھکے بھی بہت کھائے ہیں تو فوراً ان کا خط ملا کہ اگر تمہیں اپنے حالاتِ زندگی نہیں بھی لکھنے تو مولانا تقی عثمانی کی 'یادوں' کی طرح اہم واقعات وتاثرات لکھنا شروع کردو تاکہ نوجوان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مَیں اپنی بعض کمزوریوں اور نالائقیوں کی وجہ سے (جن میں سرفہرست میری کم آمیزی اور عزلت پسندی کی غیر مفید عادت ہے) آج تک مولانا حقانی کی زیارت سے بھی محروم ہوں اور مولانا تقی عثمانی مدظلہ العالی کی 'یادیں' بھی نظر سے نہیں گزرتی (سوائے اس ایک قسط کے جو ماہنامہ 'الحق' اکوڑہ خٹک نے مولانا سمیع الحق شہیدؒ کے حوالے سے شائع کی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ کراچی کے دینی پرچے لاہور میں متداول نہیں ہیں۔ راقم نے ماہنامہ 'البلاغ' کو ایک سے زیادہ دفعہ توجہ دلائی کہ البرہان کے تین اعزازی پرچے دارالعلوم کو بھیجے جاتے ہیں آپ تبادلے میں ایک پرچہ ہمیں بھی بھجوادیا کریں، جواب ندارد۔ ایک دفعہ لکھا کہ وی پی ہی بھجوادیں، خاموشی۔ اپنے دفتر کے ملازم کو ایک سے زیادہ دفعہ کہا: انہیں سالانہ زراعانت بھجوادو، بات گول۔

خیر تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ اس تحریر کا اگر کوئی مفید پہلو سامنے آتا ہے تو اس کے اجر کے مستحق

---

[۱] مولانا عبدالقیوم حقانی پاکستان کے دینی علمی حلقوں کی معروف شخصیت ہیں۔ جامعہ حقانیہ کے فاضل، مولانا سمیع الحقؒ کے ساتھی، مصنف کتب کثیرہ (خصوصاً ۱۳ جلدوں میں شرح مسلم)، مہتمم جامعہ ابی ہریرہؓ خالق آباد (نوشہرہ۔ کے پی کے)، بانی مدیر ماہنامہ القاسم، القاسم اکیڈمی (جس نے بے شمار مفید دینی علمی کتابیں شائع کی ہیں) کے سربراہ، مقرر دلپذیر، ادیبِ شہیر، خوردنواز اور ....اور.... ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔ اللہ تعالیٰ مولانا کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے تاکہ طالبان علم ان سے استفادہ کرتے رہیں، آمین۔

مولانا عبدالقیوم حقانی ہیں اور اگر خدانخواستہ اس کے برعکس ہوتا ہے تو اس کا سزاوار مَیں ہوں۔

جب مَیں سعودی عرب میں طالب علم تھا تو الاخوان المسلمون شام کے شیخ مصطفی السباعیؒ کا ایک کتابچہ نظر سے گزرا تھا جس کا عنوان تھا ÏFLQøpžhźyÙ"XʒĈ ۔ اسے سرسری دیکھا تھا جو ان کی زندگی کے علمی ودعوتی واقعات وتجربات کا مجموعہ تھا۔ جب مولانا حقانی نے توجہ دلائی تو مجھے وہ یاد آ گیا اور اس سلسلے کا نام ’’مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا؟‘‘ میرے ذہن میں درآیا۔ مَیں اسے باقاعدگی سے لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ کبھی کبھار کوئی واقعہ یاد آ گیا اور مفید لگا تو قلم گھسیٹتا رہوں گا، بشرطِ توفیقِ ایزدی۔

قارئین کرام! اس طوالانی تمہید کے لیے معذرت اور اب آیئے آج کے عنوان کی طرف]۔

عیدالفطر (۵ جون ۲۰۱۹ء) کی شام حسب معمول استاد گرامی احمد جاوید صاحب کو ملنے گیا جو رمضان شریف حرمین میں گزار کر آئے تھے۔ عمیر اور خباب (دونوں بیٹے) بھی ساتھ تھے۔ ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ اور ان کے ساتھی ائیر پورٹ پر سعودی عملے کے پاکستانیوں کے ساتھ ناروا، بدتمیزی اور حقارت پر مبنی سلوک (بلکہ بدسلوکی) سے دل گرفتہ تھے۔ بات سعودیوں کی بعض خوبیوں کے ساتھ ان کے اکھڑ پن، بدتہذیبی، گوری چمڑی والوں کے آگے بچھ جانے اور پاکستانیوں (بنگالیوں وغیرہ) کے ساتھ حقارت آمیز رویے کی ہونے لگی تو راقم کو بھی اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا جو احباب کو سنایا۔

راقم بسلسلہ تعلیم وملازمت تقریباً دس سال (۱۹۷۶ء۔۱۹۸۶ء) ریاض میں مقیم رہا۔ اس سارا عرصہ اہل وعیال بھی ساتھ رہے۔ الحمدللہ کہ شاپنگ کی لت اہلیہ کو نہ تھی اس لیے کبھی کبھار ہی بازار (بڑی مارکیٹوں میں) جانا ہوتا تھا۔ روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں محلے کی دوکان سے خرید لاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی ضرورت سے مارکیٹ جانا پڑا۔ بچے ساتھ تھے۔ پارکنگ میں رش تھا تو میں نے اپنی گاڑی ایک گاڑی کے عقب میں اتنے فاصلے سے اور اس طرح کھڑی کی کہ وہ صاحب سائڈ سے گاڑی نکال سکتے۔ جب واپس آئے اور مَیں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو ایک سعودی صاحب آئے اور ناراض ہونے لگے کہ مَیں نے گاڑی غلط پارک کی، ان کا راستہ روکا

اور انہیں انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی۔ میں نے معذرت کی اور انہیں بتایا کہ مَیں نے گاڑی اس طرح پارک کی تھی کہ وہ اپنی گاڑی نکال سکتے تھے لیکن میرے جانے کے بعد دوسری گاڑیاں نکلیں اور نئی آئیں اور اس طرح پارک ہوگئیں کہ ان کا راستہ بند ہوگیا۔ مَیں نے انہیں یقین دلایا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا اور دوبارہ ان سے معافی چاہی لیکن وہ صاحب بھنا گئے اور غصہ کرنے لگے۔ پوچھا کہ تم کرتے کیا ہو؟ مَیں نے بتایا کہ جامعہ میں دراسات علیا کا طالب علم ہوں تو وہ اور شیر ہوگئے۔ کہنے لگے "ÕB LŻ± ľ" تم گدھے ہو۔ گاڑی خرید لی ہے (ہمارے پیسوں سے) اور چلانے ، پارک کرنے کی ذرا تمیز نہیں ہے....آپ جانیں جب اہل وعیال ساتھ ہوں اور کوئی بے عزتی کرے تو کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے تاہم چونکہ مَیں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ جان چھڑانا چاہتا تھا اس لیے مَیں نے صبر سے کام لیا۔ اس سے کہا کہ "Lý". "nç ?ø Lhg" "Ołu ÕB" "Ym Ŭžy pľ" (میں آپ سے کیا کہوں، آپ تو مجھ سے بڑے (؟) ہیں)۔ یہ کہہ کر میں گاڑی میں بیٹھا اور ایکسی لیٹر دبا دیا۔

بقیہ: مغربی تہذیب کا ناسور

ایک طرف اسلام کی یہ تعلیمات ہیں اور ماضی میں اُمت مسلمہ کے اسلاف ان کی پاس داری کرتے رہے ہیں، جب کہ دوسری طرف دورِ حاضر کا مسلمان ہے کہ اسے ہر وہ چیز اچھی لگتی ہے جو یہود و نصاری سے منسوب ہو اور ان سے مروی اور منقول ہو۔ چنانچہ اس حوالے سے اگر پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کے احوال پر نگاہ ڈالی جائے تو صورت حال انتہائی ناگفتہ بہ ہے اور یہ اُمت یہود و نصاری اور ہنود کی تہذیب و ثقافت میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا رہن سہن، بود و باش اور طرز زندگی مغربی تہذیب سے ماخوذ اور اسی کا آئینہ دار ہے۔ امّت کا بڑا طبقہ اس میں مبتلا ہے اور دنیا میں کسی قوم کی فتح و شکست کے فیصلے اس کے بڑے طبقے کی حالت اور کیفیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم فرمائے، ہمیں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت طیبہ کو اختیار کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین یا رب العالمین۔